خواتینِ ٹملناڈو کی دینی علمی و ادبی خدمات

علیم صبا نویدی

مرتبہ
ڈاکٹر جاویدہ حبیب
(ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی، (اردو) ایم اے، عربی)

خواتینِ
ٹملناڈو
کی
دینی، علمی و ادبی خدمات

علیم صبا نویدی

مرتبہ

ڈاکٹر جاویدہ حبیب
ایم اے؛ ایم فل؛ پی ایچ ڈی (اردو) ایم اے (عربی)

کتاب کا نام : خواتینِ ٹمل ناڈو کی دینی، علمی و ادبی خدمات
موضوع : تحقیق
تعداد : 786
قیمت : 400 روپئے (چار سو روپئے)
سنِ اشاعت : جنوری 2001 ء
مطبع : ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز ، چینئی 002 600
مصنف : علیم صبا نویدی
پتہ : 26 امیر النساء بیگم اسٹریٹ، چینئی 002 600
مرتبہ : جاویدہ حبیب۔ ایم۔اے، ایم۔فل۔پی ایچ ڈی (اردو)، ایم۔اے (عربی)
کمپیوٹر کتابت : اردو کمپیوٹرس، 275 محمد علی بازار، وانم باڑی 24731 : ✆

زیرِ اہتمام ● ● ● ڈاکٹر جاویدہ حبیب مدراس

ملنے کے پتے

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ممبئی، علی گڈھ
۲۔ مکتبہء شب خون ۳۱۳ رانی منڈی، الہ آباد (یو۔پی)
۳۔ اسٹار پبلی کیشنز 4/5B آصف علی روڈ، نئی دہلی۔
۴۔ مکتبہء کہار جرنل برادپورہ، بھاگلپور۔ (بہار)
۵۔ شگوفہ پبلی کیشنز معظم جاہی مارکیٹ، حیدر آباد۔ دکن
۶۔ ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز 26 امیر النساء بیگم اسٹریٹ، مونٹ روڈ، چینئی 002 600

والدۂ معظّمہ محترمہ

شرف النساء صاحب المعروف بہ استادنی آرکاٹی صاحبہ

(المتوفی ۲۰۰۰ء)

نے

اس دارفانی سے پردہ پوشی کرنے سے دوسال پیشتر
احقر کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ خواتین ٹملناڈو سے
متعلق بھی اپنے قلم کو کام میں لائے۔
چنانچے مرحومہ کی پہلی برسی کے موقعہ پر

"برائے ایصال ثواب"

خواتین ٹملناڈو کی خدمات میں یہ انمول تحفہ پیش ہے

علیم صبانویدی

ہدیۂ امتنان و تشکر

- ڈاکٹر ذاکرہ غوث، مدراس
- ڈاکٹر محمد علی اثرؔ، حیدر آباد
- مولانا کاظمؔ نائطی، مدراس
- مولانا ڈاکٹر راہیؔ فدائی، کڈپہ
- مولانا محمد یعقوب اسلم عمری، وانمباڑی
- ڈاکٹر افضل الدین اقبال حیدر آباد
- ڈاکٹر جاویدہ حبیب مدراس

کی بے لوث آراء، بے کراں محبتوں اور بیش بہا عنایتوں کے

ساتھ ساتھ

- کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد

اور

- کتب خانہ مدرسۂ محمدی، مدراس

کے پر خلوص کارکناں کے بھر پور تعاون

نے

زیرِ نظر کتاب کو ایک تاریخی دستاویز کی شکل دی ہے

احقر ان تمام احباب اور کتب خانوں کا سراپا سپاس ہے

فہرست

یہ سچ ہے !!! ....

جاویدہ حبیب

یہ لکھتے ہوئے مجھے نہایت مسرت ہوتی ہے کہ والدِ محترم علیم صبؔا نویدی نے ٹمل ناڈو میں اردو کے فروغ اور اس کی نشوونما سے متعلق کوئی موضوع تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ اس سلسلے کے کارنامے " ٹمل ناڈو میں اردو " (مطبوعہ ۱۹۹۸ ء)، " ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب " (مطبوعہ ۱۹۹۹ ء)، " ٹمل ناڈو کے صاحبِ تصنیف علماء " (مطبوعہ ۱۹۹۶ء) اور " مولانا باقر آگاہ ویلوری کے ادبی نوادر " (مطبوعہ ۱۹۹۴ ء) اردو ادب کی تاریخ میں تا ابد روشن اور زندہ جاوید رہیں گے۔ ہنوز بعض موضوعات کے مسودے " ٹمل ناڈو میں نعت گوئی "، " ٹمل ناڈو کے علمائے کرام " اور " اردو شاعری میں نئے تجربے " قریب قریب تکمیل کے آخری مرحلے میں ہیں۔

فی الحال میرے پیش نظر والدِ محترم کا تازہ ترین کارنامہ " خواتینِ ٹمل ناڈو کی دینی، علمی و ادبی خدمات " ہے جس میں آپ کی تلاش و جستجو کی لو تیز تر ہے اور معلومات فراہمی کی پرواز بلند۔ جن خواتین کے نام اور کام سے کماحقہٗ ٹمل ناڈو کی ادبی دنیا بڑی حد تک نابلد ہے ان کو متعارف کرانے میں آپ کی موجودہ کاوش بڑی اہم اور مستحسن ہے۔ بعض خواتین کا کہنا ہے کہ مدراس یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام بہت سارے موضوعات پر کام ہوا ہے۔ لیکن جہاں تک والدِ محترم کا تجربہ اور مشاہدہ ہے اس دانش گاہ میں جو بھی کام ہوا ہے وہ ناقص ہی ہوا ہے۔ والدِ محترم کا کہنا ہے کہ " نااہل اساتذہ کی نگرانی میں جو بھی کام ہوا ہے وہ چھپنے کے قابل نہیں ہوتا بلکہ چھپنے کے لائق ہوتا ہے "۔ اہلِ مدراس بھی اس سے بخوبی واقف ہیں کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے۔

والدِ محترم کے نام آئے ہوئے سیکڑوں مکتوبات میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک جملہ ذہن و دل پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ جملہ یہ ہے :

" کسی ستائش اور صلے کی تمنا کے بغیر اردو ادب میں کام کرتے رہنا ہی بہت بڑا کام

ہے۔ آپ (علیم صبانویدی) نے بہت کام کیا ہے"۔

اور پھر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ جملہ :

کتاب " ٹمل ناڈو میں اردو" پڑھی۔ میں نے اس کتاب سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے"۔

اسی طرح سے خراجِ تحسین سے معمور گرامی نامہء حضرت علیم صبانویدی کی خدمت میں پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر یوسف سرمست، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر محمد علی صدیقی وغیرہم نے پیش کیے ہیں، جن کی روشنی میں اردو ادب میں حضرت علیم صبانویدی کے مقام و مرتبہ کا تعین ہوتا ہے۔ بالخصوص ٹمل ناڈو کے ادبی جغرافیہ کو ساری اردو دنیا سے متعارف کرانے میں آپ نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ ہمیشہ روشن رہیں گے۔

میں سمجھتی ہوں کہ بیسویں صدی میں افضل العلماء مولانا مولوی عبد الحق اور علامہ شاکر نائطی کے بعد ٹمل ناڈو کی علمی وادبی آبرو کو محفوظ رکھنے میں علیم صبانویدی نے بڑی جدوجہد سے کام لیا ہے۔ والدِ محترم کی اس علمی وادبی جدوجہد سے ٹمل ناڈو کے حاسدوں کا بڑا گروہ نہ صرف نالاں ہے بلکہ ان کے نیک کاموں میں رخنہ ڈالنے میں بھی پیش پیش ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں نیک ہدایت دے۔

والدِ محترم ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ " جن متعصب احباب کی فطرت میں کم ظرفی کے مہلک جراثیم سرایت کر گئے ہیں وہ ان جراثیم سے کیسے نجات حاصل کر سکتے ہیں"۔ ؟

لیجئے آپ کے روبرو " خواتینِ ٹمل ناڈو کی دینی، علمی وادبی خدمات " سے متعلق ایک تاریخی دستاویز بہ صورت کتاب موجود ہے۔ آپ قاری بھی ہیں اور ناقد بھی۔ آپ ہی بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت علیم صبانویدی کی بے لوث محنتیں کہاں تک ناچیز کے خیالات کی عکاسی کرتی ہیں اور حضرت موصوف کی تحریریں جو ان مٹ اور لازوال صداقتوں پر مبنی ہیں اُن کی روشنی آپ کے دلوں میں کس حد تک پھیل کر موصوف کے حق میں دعاؤں کے پھول کھلاتی ہیں۔

۱۰ جنوری ۲۰۰۱ء　　　　جاویدہ حبیب

نقشِ اوّل

خواتین نے ابتدا ہی سے مختلف شعبہ ہائے حیات میں اپنی گوناگوں صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے تاہم سماج میں خواتین کو کیا مقام حاصل ہونا چاہئے یہ مسئلہ ہمیشہ سے عالمی مفکرین کا ایک اہم موضوع رہا ہے افلاطون اور کارل مارکس کو چھوڑ کر کم و بیش تمام مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ طبعی اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت مردوں کے مقابلے میں کمتر حیثیت کی حامل ہے اور سماج میں صنف نازک کا مقام متعین کرتے وقت اس بنیادی حقیقت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

افلاطون جس نے مرد اور عورت کی مساوات کا نظریہ پیش کیا تھا وہ بھی بالآخر اس اصول کی حمایت کرتا ہے۔ صرف کارل مارکس ایک ایسا مفکر ہے جس نے اس اصول سے بالکلیہ اختلاف کیا ہے۔ اس کے خیال میں عورت کی طبعی اور ذہنی کمزوری اس کی معاشی مجبوری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مردوں نے عورتوں کو اپنا غلام بنائے رکھا۔ اگر عورت معاشی اعتبار سے آزاد اور خود مکتفی ہو جائے تو اس کی طبعی اور ذہنی صلاحیتیں کسی بھی اعتبار سے مرد کی صلاحیتوں سے کمتر نہیں ہیں۔

علامہ اقبال نے سماج نے عورت کے مقام کے تعین کے سلسلے میں جو نظریہ پیش کیا ہے وہ مذہبِ اسلام کی بنیادی تعلیمات پر مبنی ہے۔ اسلام نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات کی تعلیم دی ہے اور دنیا کے مختلف معاشروں میں عورتوں پر جو ظلم و ستم روا رکھا گیا تھا اس کی شدت سے مخالفت کی ہے لیکن اسلام ایک حقیقت پسند مذہب ہے جو عورتوں کی استعداد کے مطابق انہیں ذمہ داریاں دینے کی تائید کرتا ہے۔

اس مختصر سی تمہید کی روشنی میں جب ہم عورتوں کی مختلف النوع، سماجی، تہذیبی، تعلیمی، تاریخی، ادبی، سائنسی اور امور خانہ داری سے متعلق غیر معمولی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ صنفِ نازک کہلائی جانے والی خواتین نے درونِ خانہ ذمہ داریوں کے پہلو بہ پہلو کس قدر گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ خواتین کی خدمات کے سلسلہ میں جو اہم کاوشیں منظر عام پر آئی ہیں ان میں غالباً پہلا تذکرہ "بہارستان ناز" (مولف حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی) ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا اس تذکرہ میں ایک سو چوہتر (۱۷۴) شاعرات کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس دور کی طوائفین کا بھی بڑے ادب و احترام سے تذکرہ کیا ہے[۱] حضرت مودود صدیقی نے اس تذکرہ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ حکیم فصیح الدین رنج نے مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا سرسید سے بہت پہلے "تعلیم نسوان" کی طرف توجہ دی اور یہاں تک کہ اہل مغرب بھی اس تذکرہ نگاری کے دور سے متاثر ہو کر انگریزی و

فرانسیسی زبانوں میں تذکرے لکھے۔

حضرت مودود صدیقی کا کہنا ہے کہ "بہارستانِ ناز" کی اشاعت کے بعد ۱۸۷۶ء میں پہلی بار لندن یونیورسٹی میں عورتوں کو امتحان میں شرکت کی اجازت دی گئی۔

اس تذکرے کے اشاعت کے بعد ۱۸۸۱ء میں عبدالحی صفابدایونی کا تذکرہ "شمیم سخن" منظرِ عام پر آیا جس میں ایک سو اکاون (۱۵۱) شاعرات کا ذکر موجود ہے۔

ان دو تذکروں کے بعد تیسرا تذکرہ مولوی محمد عباس لاہوری کا ہے جو ۱۹۰۲ء میں "مشاہیر نسوان" کے نام سے ظہور پذیر ہوا۔ (۲) اس تذکرے میں ہندوستان، ایران، عرب اور یورپ کی مشہور خواتین کے مختلف طبقوں کے حالات اور کمالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مولوی عباس صاحب کے تذکرے کے بعد جناب عبدالرزاق بسمل کا تذکرہ (۳) "تذکرۂ جمیل" منظرِ عام پر آیا جس میں مشاہیر خواتین کا جائزہ تو تھا لیکن دکن کی خواتین کی نئی پود جو اپنی اعلیٰ وارفع علمی خدمات اور سماجی کارروائیوں کی وجہ سے ممتاز مقام رکھتی تھی ان کا تفصیلی ذکر نہیں ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے جنوب کے آفاق گیر شہرت رکھنے والے محقق مولوی نصیرالدین ہاشمی نے ایک کتاب بنام "حیدرآباد کی نسوانی دنیا (۴) ۱۹۴۴ء (۱۳۶۳ھ میں) اردو ادب کو دی جس میں مولوی موصوف نے حیدرآباد کے تیئیس ۲۳ ستاروں کی نورانی چمک سے دنیائے ادب کو روشناس کیا ان ستاروں میں ہزہائی نس شہزادی، درشہوار دردانہ بیگم، شہزادی نیلوفر، فرحت بیگم، بیگم ولی الدولہ، بیگم مہدی نواز جنگ، رانی شامراج. سروجنی نائیڈو، صغرا ہمایون مرزا، مسز نندی، مس پدم جا نائیڈو، مس لیلیٰ منی نائیڈو، باشا بیگم صوفی، بیگم امیر حسن، مس ایڈلا ڈالامہ، مسز پلے، مسز اوبل ریڈی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس تذکرے سے دکن کی نئی پود کو خواتین کی ناقابلِ فراموش علمی، معاشی، سماجی اور سرکاری خدمات کو بڑی عرق ریزی، جانفشانی، خاص لگن، اور انہماک کے ساتھ اُجاگر کیا ہے جو یقیناً تاریخِ ادبِ اردو میں ایک اضافہ ہیں کسی صلہ، تمنا اور غرض سے مبرا ہو کر مولوی نصیرالدین ہاشمی نے جو خدمات انجام دی ہیں اُن کا نئی نسل کی خواتین کو احسان مند ہونا نہایت ضروری اور لازمی ہے

اس تذکرے کے بعد مولوی فصیح الدین بلخی کا تذکرہ۔ تذکرۂ نسوان ہند جو ہندوستان کی پانچ سو شاعرات، مصنفات، کے حالات پر مشتمل ہے، ۱۹۵۶ء میں منظر عالم پر آیا۔ اس تذکرے میں رضیہ سلطان شیریں (المتوفی ۶۴۳ھ) گل بدن بیگم (شہنشاہِ بابر کی بیٹی جو مصنفہ ہمایون نامہ) تھیں اس کتاب کا ترجمہ انگریزی زبان میں بیورج (Beuerige) نے کیا تھا) جاناں بیگم (دخترِ عبدالرحیم خان خاناں)، نور جہاں بیگم مخفی (اہلیہ شہنشاہ جہانگیر تھیں (زیب النساء مخفی المتوفی ۱۱۱۲ھ (دختر شہنشاہ اورنگ زیب اور مصنفہ "مونس الارواح" اور "زیب التفاسیر" تھیں)، چندا ماہ لقا (چندا کو بعض محققین نے اردو شاعری کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ کہا ہے لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں اردو کی پہلی صاحب دیوان

شاعرہ چندا نہیں بلکہ لطف النساء امتیاز ہے)" دلہن (نواب انتظام الدولہ کی دختر اور نواب آصف الدولہ والیِ اودھ کی زوجہ تھیں) حیات النساء حیا (شاہ عالم ثانی بادشاہ کی دختر تھی) بیگم عشرت محل (زوجہ نواب واجد علی شاہ اودھ)، اشمہ آرکاٹی (زوجہ نواب عبدالغنی خان امیر اور مصنفہ مثنوی "گلبن مہ رخاں" مثنوی گلشن مہوشان" مثنوی "گلشن شاہداں" مثنوی "گلشن عاشقاں" تھیں) امرتا پریتم، لیلاوتی شریمتی ہر دیوی، صغریٰ ہمایوں مرزا، ڈاکٹر رشید جہاں، عصمت چغتائی، مہادیوی ورما، قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، ممتاز شیریں، سرلا دیوی، حجاب امتیاز علی، مسز سروجنی نائیڈو، جیلانی بانو اور زہرہ نگاہ کا تذکرہ صاحبِ تصنیف نے شاعرات اور ادیبوں میں کیا ہے۔

حالیہ دور میں حضرت طالب ہاشمی کی کتاب "تاریخ اسلام کی چار سو باکمال خواتین (مطبوعہ ۱۹۹۸ء لاہور) منصۂ ظہور میں آئی ہے۔ یہ کتاب پہلی صدی ہجری سے شروع ہو کر چودہویں صدی ہجری پر محیط ہے اس کتاب میں حضرت موصوف نے ان باکمال خواتین کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اپنے علم ودانش، ذہانت وفطانت، فہم وفراست، عزم واستقلال، جذبہ ایثار، پاکیزہ قلبی محبت اور وفاداری شجاعت وکامرانی اور بلند حوصلگی کی ان مٹ اور ان مول مثالین پیش کی ہیں اور جن خواتین میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کا بے پایاں جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا ان پر بھی روشنی ڈالی ہے گویا یہ باکمال خواتین کسی نہ کسی پہلو سے یکتائے زمانہ تھیں حضرت طالب ہاشمی کا یہ کارنامہ بھی یقیناً تاریخ میں نور علیٰ نور ہے۔

اردو ادب میں اوّل اوّل خواتین کی ذہنی پرورش وپرداخت اور دینی تعلیم وتربیت کی طرف اپنی شعری کاوشوں کے ذریعہ رغبت دلانے والی شخصیات میں خاندان نوائط کی عہد آفریں ہستی مولانا مولوی باقر آگاہ ویلوریؒ (۵) کے علاوہ مولانا مولوی عبدالحی واعظ بنگلوریؒ (٦) کا نام اور کام ہمیشہ اردو ادب کی بارگاہ میں روشن رہے گا مولانا باقر آگاہ ویلوریؒ کے بعد اس سلسلے کو آگے بڑھانے والوں میں قاضی بدرالدولہ اور ان کے خاندان کے اربابِ علم وفن پیش پیش رہے ہیں۔ بالخصوص نوابینِ آرکاٹ کے دور میں اہلِ نائط نے نہ صرف قوم وملک کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں بلکہ خواتین کو تحصیلِ علم کی طرف رجوع کرنے میں بھرپور کامیابی حاصل کی۔

انیسویں صدی میں خانوادۂ قاضی بدرالدولہ کی خواتین میں آمنہ بی، حسینہ بی، امتہ العزیز، سکینہ بی، نعیمہ بیگم، امتہ الرب، ہاجرہ بیگم، امتہ الولی ولیہ بیگم کے علاوہ والا جاہی خاندان کی خواتین میں خدیجہ ضیا، امتہ الرحمان الفت النساء الفت، ممتاز، قادر النساء شوکت، حبیب النساء، مہر النساء، اشمہ آرکاٹی، خاتون بی بی عاجزہ، مہر النساء اور بیسویں اور اکیسویں صدی کہ اوائل میں حسنیٰ بیگم، نواب امتہ الحی مبشر النساء بیگم حیا، کاظمہ بیگم، حجاب امتیاز علی تاج، جی زڈ رضیہ بیگم، ڈاکٹر ذاکرہ غوث، ہاجرہ بیگم (دختر افضل العلماء مولانا عبدالحق المتوفی ۱۹۵۸ء) ڈاکٹر پروین فاطمہ، نعیمہ پرویز، فاطمہ رئیس راحت محمودہ،

سعیدہ عطااللہ، فیض النساء، عرفانہ تزئین، منور رشید، عطیہ کوثر اور جاویدہ حبیب کی اردو خدمات کا اعتراف نہ کرنا یقیناً ادبی بد دیانتی ہے۔

آج ہندوستان کے ہر علاقے کی مشاہیر نسوان کے تذکرے کی اشد ضرورت ہے غالباً ۱۹۵۶ء کے بعد ہندوستانی خواتین شعراء، ادباء اور افسانہ نگاروں کا کوئی تذکرہ منصۂ شہود پر نہیں آیا ہے۔ اس احساس کے پیشِ نظر راقم الحروف نے ٹمل ناڈو کی مشاہیر خواتین کی علمی ادبی و دینی خدمات کا تذکرہ ترتیب دیا ہے جو مستقبل میں ایک مستنبط تحقیق کے ایک اہم اشاریہ کی نوعیت کا حامل ہوگا۔

حوالہ جات

(۱) اردو شاعرات کا اولین تذکرہ نگار۔۔۔ مطبوعہ ہفت روزہ "میرٹھ میلہ" میرٹھ (یوپی) شمارہ نمبر ۳۸ صفحہ ۱

(۲) مولانا راشد الخیری نے ماہنامہ "عصمت" دھلی اور ممتاز علی اور ان کی اہلیہ بیگم محمدی نے ہفت روزہ "تہذیب النسوان" لاہور سے خواتین کے لئے جاری کیا۔

۱۹۱۶ء میں شہر مدراس سے مولانا عبدالمجید شرر آلندوری نے خواتین کے لئے ایک ماہنامہ "رسالہ نور" جاری کیا جس کے دس پندرہ شمارے راقم نے "کتب خانہ اہل اسلام" والاجاہ روڈ، مدراس (اس کتب خانہ کی بنیاد گورنمنٹ ایجنٹ ایڈورڈ بالفور نے ۱۸۵۰ء میں رکھی اور اس کے سرپرست نواب غوث خان اعظم اور گورنر آف مدراس سرہنری پینجر بنائے گئے تھے) دیکھے تھے۔ چند سالوں سے یہ کتب خانہ اپنی جگہ سے غائب ہے سنا ہے کہ ایک نااہل خاتون نے اس کتب خانے کی عمارت کو مسمار کر کے اس بین الاقوامی کتب خانہ کے دینی علمی و ادبی خزانے کو کہیں روپوش کر دیا ہے اس کتب خانہ کی تباہی اور انمول اور بے مثل کتابوں کے غائب ہو جانے کا احساس آج تک کسی فرد کو نہیں ہوا ۔۔۔ ٹمل ناڈو کے اردو بولنے والوں کی مردہ دلی کی یہ مثال تاریخ میں ہمیشہ یاد اور روشن رہے گی

(۳) عبدالرزاق بسمل حیدر آبادی صاحب نے خواتین کے لئے ایک ماہنامہ "ناہید" حیدر آباد سے ۱۹۳۸ء میں جاری کیا۔

(۴) اس کتاب سے پہلے مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کی خواتین سے متعلق تین اور کتابیں عالم ظہور میں آئیں جن کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

1۔ خواتین عہدِ عثمانی مطبوعہ ۱۹۳۶ء

2۔ خیابانِ نسوان مطبوعہ ۱۹۳۸ء

3۔ خواتینِ دکن کی اردو خدمات ۱۹۴۰ء

(۵) تحفۃ النساء از مولانا مولوی باقر آگاہ ویلوری مطبوعہ ۱۲۶۲ھ

(۶) جنان السیر از مولانا مولوی عبدالحی واعظ بنگلوری مطبوعہ ــــ ء

آمنہ بی عرف امین صاحبہ

آمنہ بیقاضی بدرالدولہ کی تیسری اہلیہ تھیں۔ آپ بمقام میلاپور مدراس ۲۹ رمضان ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۴ء کو پیدا ہوئیں۔ آپ کے والدِ بزرگوار کا نام محمد مصطفےٰ تھا اور ماں کا نام فاطمہ اُمّو بی تھا۔ آپ کی تاریخ عقد ۱۲۵۰ھ ہے۔ آپ نے کم عمری میں خانہ داری کی ذمہ داری سنبھالی تھیں۔ چونکہ ان کی شادی گیارہ سال میں ہو گئی تھی، اس لئے انہوں نے قاضی بدرالدولہ کی بڑی بہن فاطمہ بیگم کی سرپرستی حاصل کی تھی۔ گویا گھریلو زندگی کی تمام تر تربیت میں فاطمہ بیگم کا ہاتھ تھا۔ قاضی بدرالدولہ اور آمنہ کے درمیان عمر کا بڑا فرق تھا۔ تاہم دونوں نے اپنی زندگی بڑی کامیابی و کامرانی کے ساتھ بسر کی۔ قدیم روایات کے مطابق انہوں نے معمولی دینی تعلیم ہی حاصل کی تھی، لیکن ایک عالم باعمل کی رفاقت نے ان کے اندر بھی اعلیٰ جذبہء حصولِ علم پیدا کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ علم و عمل کے زینے طے کرتی گئیں یہاں تک کہ انہوں نے دینی مسائل پر بھی قدرت حاصل کر لی۔ انہوں نے بذاتِ خود متعدد کتابوں کی خوش نویسی کی ہے جو اس خاندان کا دیرینہ وصف تھا۔ ان کی خوش نویسی کی دلیل فقہ کی کتاب "کفایت الاسلام" ہے۔ یہ کتاب ۱۲۷۸ھ میں آپ کے دستِ مبارکہ سے نقل ہوئی تھی۔ جو آج بھی مدرسہء محمدی میں محفوظ ہے۔ موصوفہ نے ایک کتاب تالیف بھی کی ہے جو "چہل حدیث" کے نام سے بے حد مشہور ہے۔ اور یہ کتاب برسوں مدرسہ محمدی کے تعلیمی نصاب میں شامل تھی۔ انہوں نے بہت ساری کتابیں بھی اردو زبان میں (جو ہندی کے نام سے لکھی جاتی تھیں) ترجمہ کی ہیں۔ ان کا بڑا کارنامہ چالیس حدیثوں کا ترجمہ ہے۔ اس "چہل حدیث" کی اشاعت "انجمنِ اصلاحِ العشیرہ" حیدرآباد کی جانب سے پچاس سال پہلے ہوئی تھی۔ آج کل یہ کتاب نایاب ہے۔

آمنہ بی کی زندگی کے مختصر حالات خود ان کے پوتے حضرت حبیب اللہ تیّر نے کتابی

صورت میں شائع کئے ہیں۔ یہ کتابچہ بھی احقر نے مدرسہ ء محمدی میں تقریباً دس بارہ سال پہلے دیکھا تھا۔ قاضی بدرالدولہ کی رحلت کے بعد موصوفہ نے اپنی اولاد کی تربیت میں خاص توجہ دی تھی۔ ان کے تربیت شدہ بچے خاندان اور قوم کے لئے باعثِ فخر ثابت ہوئے۔ انہوں نے زندگی بڑی کفایت شعاری سے بسر کی۔ قاضی بدرالدولہ کے وصال کے بعد پنشن بھی غالباً چالیس روپے مقرر رہوئی۔ اولاد کی تربیت اور گھریلو اخراجات کے لئے کافی نہیں تھے۔ پھر بھی موصوفہ نے اپنے خاندان میں کفایت شعاری اور سلیقہ مندی کی ایک ایسی مثال قائم کی تھی جو سب کے لئے رہ نما تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ موصوفہ کا سلوک اپنی سوتیلی اولاد کے ساتھ بھی مساوی تھا۔ ان کی اولاد میں حسین عطاء اللہ، حاجی احمد مدنی، مفتی محمود، شمس العلماء قاضی عبید اللہ، ابو محمد خلیل اللہ بے حد مشہور ہوئے۔ ان کے دامادوں میں محمد غوث انتظام خان (حسینہ کے شوہر)، غلام محمد شرف الدولہ (حلیمہ کے شوہر) اور ناصر الدین محمد (عائشہ بی کے شوہر) نے علم دین میں بہت اونچا مقام پیدا کیا جن کے باعث ان کی لڑکیوں کے نام بھی معروف و مشہور ہوئے۔

آپ کی وفات ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۳ء بمقام مکہ معظمہ ہوئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

☆☆☆

اثیمہ آرکاٹی

آرکاٹ کے قادر الکلام اور باکمال شاعروں میں لطف النساء اثیمہ آرکاٹی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ جنوبی ہند کی خاتون شعراء میں لطف النساء امتیاز اور مہ لقابائی چند اصاحبِ دیوان گذری ہیں۔ دکن کی ایک اور خاتون شاعرہ گنا بیگم شوق جو آصف جاہ اول کی حرم محرم تھیں اپنی سخن سنجی اور سخن فہمی میں نہایت مشہور تھیں۔ ان گنی چنی خاتون شعراء میں اثیمہ آرکاٹی بہ حیثیتِ شاعرہ اور نثر نگار غیر معمولی اہمیت کی تاجدار ہیں۔ لطف النساء بیگم اثیمہ آرکاٹ کے ایک مذہبی اور علمی گھرانے کی باصلاحیت ادیبہ اور شاعرہ تھیں۔ ان کی تاریخِ پیدائش محققین نے ۱۲۴۱ھ یا ۱۲۴۲ھ بتائی ہے۔ اثیمہ کی شادی کم سنی میں قادر محی الدین خان جنگ ثانی سے ہوئی تھی۔ ان کے شوہر کا سالِ وفات "صاحب سخنوران بلند فکر" کے مطابق ۱۲۶۶ھ ۱۸۴۹ھ ہے۔ اثیمہ کی صحیح تاریخِ وفات کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ان کے کلام کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۲۸۹ھ تک بقیدِ حیات رہیں اور ان کی آخری تصنیف "گلشنِ شاہداں" ۱۲۸۹ھ کی تصنیف ہے۔ اثیمہ کے شوہر سکندر جنگ بہادر نواب عظیم جاہ بہادر کے حقیقی خالہ زاد بھائی اور نواب انور الدین شہید کے پرنواسے تھے۔(۱)

اثیمہ کے اجداد میں فرخ شاہ اور سلیمان شاہ کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں جو فرمانروایانِ کابل تھے۔ اثیمہ کے والد حاجی نجف علی خان المتخلص بہ افتخار (۲) کثیر العیال تھے۔ ان کے بڑے صاحب زادے اعتماد الدولہ اور دوسرے قادر علی بہادر منور جنگ نظیر تھے (۳)۔ اثیمہ نے اپنے کلام میں اپنی ایک بڑی بہن کا بھی تذکرہ کیا ہے جو نواب غلام مرتضٰی خان بہادر ثابت جنگ ممتاز الملک رفیع الدولہ سے منسوب تھیں اور وہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور شعر بھی کہتی تھیں۔(۴)

اشمہ کی تعلیم و تربیت ان کے والدِ بزرگوار نجف علی خان افتخار کے ہاتھوں ہوئی جو فارسی اور عربی کے بلند پایہ عالم اور باکمال شاعر تھے۔ افتخار کی مشہور مثنویاں ''بہاریہ'' اور '' خزانیہ '' کو کافی شہرت حاصل ہے۔ (۵)

اشمہ آرکاٹی کے تینوں صاحب زادے عبدالغنی خان امیر، عبدالواسع خان، عبدالصمد خان ماہر تینوں عالم و فضل اور باکمال شاعر تھے اشمہ کو اپنے فرزندوں پر ناز تھا چنانچہ وہ کہتی تھیں۔

یہی ہیں مرے مایہ کائنات یہی حاصلِ زندگی و حیات

جناب کاوش بدری نے اپنے مضمون '' شہزادی اشمہ آرکاٹی کی مثنویاں '' میں ان کی مندرجہ ذیل آٹھ تصانیف کا ذکر کیا ہے (۶)۔

۱۔ قصہ جہاں ضرب ۲۔ دیوانِ اردو ۳۔ مثنوی گلشنِ مہوشاں
۴۔ مثنوی گلشنِ عاشقاں ۵۔ مثنوی گلشنِ شاہداں ۶۔ نسب نامہ والا جاہی
۷۔ تعلیم نامہ ۸۔ جہاں فریب (۷)

اشمہ آرکاٹی کی تصانیف کی تعداد کے تعلق سے کاوش بدری کا مذکورہ بیان محل نظر ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اشمہ آرکاٹی کے کسی محقق نے بھی ان کی تصانیف کی تعداد پانچ سے زیادہ نہیں بتائی ہے۔ خود اشمہ آرکاٹی نے اپنی آخری تصنیف '' گلشنِ شاہداں ''میں اعتراف کیا ہے کہ اشمہ کے پانچ حروف ہیں اسی خیال کے پیشِ نظر انہوں نے اپنی پانچ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) مثنوی گلبنِ مہ رخاں (۲) گلشنِ مہوشاں (۳) گلشنِ شاہداں
(۴) گلشنِ عاشقاں (۵) اردود دیوان

مندرجہ بالا تصانیف میں '' گلشنِ عاشقاں '' نثر میں ہے اور باقی تمام تصانیف ان کی شعری تخلیقات ہیں۔

(۱) مثنوی '' گلبنِ مہ رخاں '' کا قلمی نسخہ اورینٹل مینو اسکرپٹ لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) کی زینت ہے۔ یہ اشمہ کی پہلی شعری تصنیف ہے جو ۱۲۶۸ھ میں سپرد قلم کی گئی۔ یہ مثنوی اشمہ نے اپنی بہو (جو نواب عبدالرحمٰن شاطر کی اہلیہ بھی ہیں) کی رونمائی میں ہدیۃً پیش کی۔ تقریباً ۱۴۰۰ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی عیدالفطر کے جشن کے موقع پر لکھی گئی اور اس میں پانچ جشنوں کا ذکر کیا گیا ہے اور باہمی ضیافتوں اور محبت و یگانیت کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس

مثنوی کے مطالعے سے آرکاٹ کے محلات کی آرائش و زیبائش نوائط عورتوں کی سلیقہ شعاری، مذہبی رسم ورواج کی پابندی یہاں کے طور طریقے مختلف قسم کے پکوان، مٹھائیاں، لباس وغیرہ کا دلچسپ مرقع پیش کیا گیا ہے۔

یہ مثنوی اپنے عہد کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔

محل کا سماں

مکاں قصر یکسر تھا عالی شان — فلک سے کرے ہم سری بیگمات
بچھا فرش اطلس کا تھا جاجا — کہے تو کہ ہے چرخِ اطلس نما
نظر آئیں بلور کے جھاڑیاں — ثریا کے ہر طرف خوشے ہیں جوں
لگیں آئینے قدِ آدم کہیں — کہیں تھے تصاویرِ نازک ادا
کہیں تھے ولایت کے گل اور شجر — طلائی اگیٹھی میں ہر میز پر
تحائف نوادر تھے خوش اختراع — کہیں شمع کا نور تھا شعاع

باغ کا سماں

محل و مکاں بسکہ پر نور تھا — چمن حوض دیکھو تو معمور تھا
چنبیلی یک منڈوہ پر بہار — ہریک طرف خوشبو سے مثل تتار
جو یک حوض کے درمیاں خوب تر — پڑا زینہ سنگ مرمر نظر
نہیں زینہ تھا بلکہ زیرِ فلک — تھا آئینہ ماہ بے ریب رشک
وہ عکس ان کا تصویر سازی کرے — تھا آئینہ بلوربازی کرے
چمن دونوں جانب تھے در کامیاب — پراز نسترن اور پراز گلاب
ہریک گل پہ بلبل تھا ہو تا فدا — گلوں کی محبت میں تھا مبتلا

(۲) مثنوی ” گلشنِ شاہداں “ کا قلمی نسخہ بھی (Oriental Manuscript Library) حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ ۶۲۹ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی ” گلبنِ مہ رخاں “ کی تصنیف کے ۲۱ سال بعد ۱۲۸۹ھ میں لکھی گئی۔ اس مثنوی میں اشمہ نے اطلاع دی ہے کہ یہ تصنیف نواب سالار جنگ اول وزیر حیدر آباد کی ایک عزیزہ کی فرمائش پر لکھی گئی تھی جن کی نوابانِ آرکاٹ سے بھی رشتہ داری تھی۔

مولوی سخاوت مرزا اس مثنوی کے قصے پر روشنی ڈالتے ہوئے اور اس کے ماخذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

" یہ مثنوی دراصل بعینہ " دریائے عشق " میر تقی میر کا پلاٹ ہے۔ جس کا ماخذ ہمارے خیال میں کوئی دکنی قصہ معلوم ہوتا ہے جس کو شاہ تراب نامی ایک بزرگ نے بھی میر تقی میر سے بہت پہلے لکھا تھا۔ (۸)

(۳) " گلشنِ عاشقاں " خان بہادر عبد الصمد خان ماہر (جن کی تصویر "صحیفہ زرین" (۹) مطبوعہ نول کشور میں موجود ہے) کی دلہن کو تحفتاً عطا کی گئی تھی۔

(۴) مثنوی " گلشنِ مہوشاں " کا مخطوطہ (Oriental Manuscript Library) حیدر آباد کا مخزونہ ہے سخاوت مرزا کی اطلاع کے مطابق یہ وہی قلمی نسخہ ہے جو اثیمہ کے فرزند خان بہادر عبد الواسع خان کی شادی کے موقع پر دلہن کی رونمائی میں خوش دامن صاحبہ (اثیمہ آرکاٹی) نے اپنی بہو طیّب النساء بیگم کو تحفہ دیا تھا۔ عبد الواسع خان کی شادی نواب ظہر الدولہ بہادر اعظم جاہ پرنس آف آرکاٹ کی صاحب زادی کے ساتھ ۱۲۸۴ھ میں ہوئی تھی۔ پیشِ نظر نسخے میں تاریخی قطعہ درج ہے جس سے ۱۲۸۴ھ کے اعداد بر آمد ہوتے ہیں۔

بگفتا سال آں دل از سر جشن   زہے ایں نوشہ تاج "تفاخر"

۳   ۱۲۸۱+۳=۱۲۸۴ھ

" گلشنِ مہوشاں " تقریباً ۱۵۰۰ اشعار اور حسبِ ذیل تینتالیس ۴۳ ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) آغازِ داستان — ۶۵ بیت

(۲) داستان جواہر شاہ سے پری زاد فیروز شاہ کے ملاقی ہونے کے بیان میں — ۸۲ بیت

(۳) داستان لعل شاہ کے تولد ہونے کے بیان میں — ۵۰ بیت

(۴) داستان شہزادہ دار گر کے تولد ہونے کے بیان میں — ۵۱ بیت

(۵) داستانِ جہاں بادشاہ اور داد گر کے تخت نشین ہونے کے بیان میں — ۴۴ بیت

(۶) داستانِ جہاں ضرب دختر جہانبان شاہ تولّد ہونے کے بیان میں — ۶۰ بیت

(۷) داستانِ فقیر احسن الدین کا جہاں ضرب کو تخت نشین کرنے کے بیان میں — ۸۵ بیت

(۸) داستانِ جہاں ضرب اور لعل بادشاہ کے وجہ عناد اور جنگ و فساد کے بیان میں — ۱۰۶ بیت

(۹) داستان مہلت کے ایام میں پری نازک بدن کا لعل بادشاہ کو تصویر

جہاں ضرب کی دکھلا کر عاشق کرنے کے بیان میں	۴۱ بیت
(۱۰) داستان جہاں ضرب صحرا میں "جہاں ستم" سے ملاقی ہونے کے بیان میں	۶۸ بیت
(۱۱) داستان جہاں رستم بازی گر زو کشتی شاہان سے کرنے اور لعل بادشاہ سبقت لے جانے کے بیان میں	۱۴۱ بیت
(۱۲) داستان لعل بادشاہ فقیر احسن الدین سے ملاقی ہونے کے بیان میں	۹۷ بیت
(۱۳) داستان لعل بادشاہ جہاں ضرب کی تنہائی او قات پروارد ہونے کے بیان میں	۲۶۲ بیت
(۱۴) داستان لعل بادشاہ جہاں ضرب کو بیدار کرکے ضرب کٹارپانے کے بیان میں	۱۰۷ بیت
(۱۵) داستان فیروز شاہ سلطان فرخندہ فال سے عرض حال کرکے جہاں ضرب کی نسبت لعل بادشاہ سے مخفی (طورپر) کرنے کے بیان میں	۲۱۱ بیت
(۱۶) داستان جہاں ضرب قباد پریزاد کے دیو غالب پر فتح یاب ہونے کے بیان میں	۲۷ بیت
(۱۷) داستان روح افزا پر داد گر عاشق ہونے کے بیان میں	۲۰۰ بیت
(۱۸) داستان لعل بادشاہ تصویر روح افزا کی جہاں قلتبانہ کی معرفت سے حاصل کرنے کے بیان میں	۲۶۴ بیت
(۱۹) داستان روح افزا کی نسبت داد گر سے تقرر پانے کے بیان میں	۷۷ بیت
(۲۰) داستان بادشاہ داد گر کی شادی کے بیان میں	۱۹۸ بیت
(۲۱) داستان قباد پریزاد روح افزا کی گلپوشی کرنے کے بیان میں	۳۸ بیت
(۲۲) داستان لعل بادشاہ جہاں ضرب سے زخم سرپانے کے بیان میں	۴۴ بیت
(۲۳) داستان ہیوا زہرہ جبین کے آنے کے بیان میں	۱۸۹ بیت
(۲۴) داستان جہاں رستم بہار افزا پر عاشق ہونے کے بیان میں	۱۲۳ بیت
(۲۵) داستان بہار افزا کی نسبت شاہ رستم سے تقرر پانے کے بیان میں	۵۶ بیت
(۲۶) داستان جہان رستم کی شادی کے بیان میں	۳۳ بیت
(۲۷) داستان بازی زنجیر کے بیان میں	۴۹ بیت
(۲۸) داستان لعل شہ علانیہ عاشقانہ کلام کرکے سزا پانے کے بیان میں	۲۰۳ بیت
(۲۹) داستان جہاں ضرب کی شادی عالم خواب میں ہونے کے بیان میں	۴۵۰ بیت
(۳۰) داستان لعل بادشاہ جہاں ضرب کو شادی سے آگاہ کرنے اور	

جہاں ضرب طوطی لانے کے بیان میں ۱۴۴ بیت

(۳۱) داستان جہاں ضرب دیو پر فتح یاب ہو کر گوشہ نشین ہونے کے بیان میں ۱۴۶ بیت

(۳۲) داستان شاہ اندر گل پوشی کرنے کے بیان میں ۱۴۴ بیت

(۳۳) داستان فقیر احسن الدین جہاں ضرب کو احوال قیامت سے آگاہ کرنے کے بیان میں ۴۷ بیت

(۳۴) جہاں ضرب کو رام کرنے کے لئے لعل بادشاہ دیو کے فساد کا حیلہ کرنے کے بیان میں ۴۷ بیت

(۳۵) داستان لعل بادشاہ کے بیمار ہونے کے بیان میں ۸۱ بیت

(۳۶) داستان جہاں ضرب کے والدین گلپوشی کرنے کے بیان میں ۶۹ بیت

(۳۷) داستان جواہر شہ دولہ دلہن کی گلپوشی کرنے اور اس کی زوجہ طلسمات سے بیمار ہونے کے باعث جہاں ضرب گفت و شنید کرنے کے بیان میں ۱۷۷ بیت

(۳۸) داستان فیروز شاہ، لعل بادشاہ اور داد گر کو خزائن تقسیم کرنے کے بیان میں ۴۴ بیت

(۳۹) داستان فقیر احسن الدین کا لعل بادشاہ اور جہاں ضرب کو ملک دمشق کا تخت نشین کرنے کے بیان میں ۷۱ بیت

(۴۰) داستان جہاں ضرب بزرگوں کی ضیافت کرنے کے بیان میں ۲۱۷ بیت

(۴۱) داستان جہاں ضرب حاملہ ہونے کے بیان میں ۱۳۶ بیت

(۴۲) داستان جہاں ضرب داستان تولد سکندر روزگار عرف ابن الفقیر واختتام کتاب ۱۳۱ بیت

ابیات اصل مثنوی ۵۳۲۶

(۴۳) تواریخِ مستخرجہ مقدس مآب فیض انتساب والد ماجد حاجی محمد علی خان بہادر وغیرہ ۵۰

جملہ ۵۳۷۶

مثنوی "گلشن مہوشاں" ۱۲۷۷ھ کی تصنیف ہے اور اشمہ کی پہلی مثنوی "گلشنِ مہ رخاں" کے نویں سال قلم بند کی گئی۔ اس مثنوی پر کئی خاتون شعراء نے تعارفی قطعات لکھے ہیں۔ لیکن اشمہ کی خوش دامن (دختر شکوہ الملک نصیر الدولہ) کا تاریخی قطعہ سب سے جامع اور دلچسپ ہے جس کے مطالعہ سے والا جاہی خواتین کا علم وادب سے خاص لگاؤ اور فصاحت و بلاغت کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں اشمہ کی خوش دامن صاحبہ کا مکمل تاریخی قطعہ درج کیا جاتا ہے۔

چچی جو شرع سے ہیں مری مادر انہوں بھی پڑھ کے اس کو ہو گئے خوش

شتابی سے اٹھا مشکیں قلم وہ	کِئے تاریخ یوں زیب رقم وہ
پسر میرے سکندر جنگ ثانی	محل ان کے بہ لطف خوش بیانی
لکھی سہ داستانِ فرحت انگیز	برنگ زلف خوبانِ دل آویز
وہ ہے اس طور جو ہے پہلے لکھی	جہاں معنی کے آئینہ میں رکھی
دوم کوزے میں جون بحر لطافت	سوم جون مشت میں شہر بلاغت
رقم سب کا ہے شام عشرت انگیز	مطالب سب کے جوں صبح طرب خیز
کہاں کوئی اس طرح زیب رقم ہے	نوادر داستان زیرِ قلم ہے
تھی سوم کی جو سب کو انتظاری	ہے تاریخ اس کی ''باغ نو بہاری''

۱۲۷۷ھ

اس مثنوی کے موضوع اور ماخذ کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی سخاوت مرزا نے لکھا ہے۔

'' مثنوی گلشنِ مہوشاں ''ایک سوشیل افسانہ ہے جس کا ماخذ ایک فارسی قصہ ہے۔ اس کا اشارہ مصنفہ نے خود اپنی سابقہ مثنوی '' گلشنِ مہ رخاں ''میں کیا ہے۔ ماخذ کا نام درج نہیں ہے اس کا ماخذ غالباً قصہ '' اگر گل'' ہے جس کا ترجمہ فارسی سے نواب محمد تقی خان ہوس لکھنوی کے کسی شاگرد نے اردو میں کیا تھا جو ۱۲۸۸ھ میں مطبع نول کشور میں چھپا۔ '' اگر گل'' کا یہی قلمی نسخہ '' ادارہ ادبیاب اردو'' حیدر آباد میں موجود ہے''۔ (۱۰)

مولوی سخاوت مرزا نے اس مثنوی کے درج ذیل اٹھارہ کرداروں کی وضاحت ہے :

(۱) جواہر شاہ (شاہِ روم)

(۲) مہ لقا محل جواہر شاہ

(۳) فیروز شاہ (شاہ اندر) شاہ جنات

(۴) فرخ لقا ۔ محل فیروز

(۵) شہزادہ لال بادشاہ۔ فرزند جواہر شاہ روم، یہی قصہ کا ہیرو ہے اور یہ فرزند نطفی ہے

(٦) شہزادہ داد گر فرزند فیروز شاہ (اور فرزند نطفی جواہر شاہ)

(۷) جہانبان شاہ (شاہ مصر)

(۸) جہاں ضرب۔ دختر جہانبان شاہ (ہیروئن) معشوق مردوں کے لباس میں

(۹) نازک بدن پری (دایہ جہاں ضرب)

(۱۰) احسن الدین درویش (جن کے اجداد دمشق کے بادشاہ تھے) پدر لطفی جہاں ضرب۔
جنہوں نے جہاں ضرب کو تعلیم وتربیت دی اور دمشق کے تخت پر جہاں ضرب کو بٹھایا۔

(۱۱) جہاں رستم فرزند شاہ یمن۔ (جہاں ضرب کا منہ بولا بھائی جو شہ پہلوان تھا)

(۱۲) روح افزا۔ دختر شہ پری اور معشوقہ شہزادہ دادگر

(۱۳) زہرہ جبیں۔ والدہ روح افزاء (شہ پری)

(۱۴) جہاں قلتبانہ، مشاطہ، جوجوگن کا بھیس لے کر کل کے گھوڑے پر سوار ہو کر بین کاندھے پر رکھ کر شہ پری کے پاس جاتی ہے اور روح افزا کی تصویر موم پر نقش کر کے دانتوں میں چھپا کر لاتی ہے اور باوجود سخت نگرانی اور جامہ تلاشی کے راز فاش نہیں ہونے دیتی۔

(۱۵) سکندر روزگار عرف ابن الفقیر۔ جہاں ضرب کا فرزند دلبند

(۱۶) انجم افروز۔ وزیر جواہر شہ۔

(۱۷) مشتری، وزیر فیروز شہ۔

(۱۸) شاہ دیو۔ ایک سرکش دیو پر لعل شاہ کا غلبہ اور طلسماتی محلات پر لعل شاہ کا قبضہ

اس مثنوی میں اشمہ نے بعض شادی کی رسومات کی تصویریں بڑے دلکش اور پیارے انداز میں کھینچی ہیں بالخصوص جلوہ کی رسم جو ہندوستانی خاص الخاص رسم ہے جس کے بغیر شادی کا لطف ادھورا سمجھا جاتا ہے۔ اشمہ نے ایک دکھنی دلہن کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

وہ رنگ حنا چست سو ہا لباس — وہ سنگھار وہ زیور وہ پھولوں کی باس
بھی تھا سرخ جوڑے پہ عطر سہاگ — بھڑک کر اٹھی حسن طلعت کی آگ
نکالا ہے جب درمیاں سے حجاب — چنا کر نبات اس نے اس دم شتاب
لطافت سے جب منہ دکھانے لگی — تو نوشہ پہ احسان جتانے لگی

پھر دولہ میاں کی بے چینی کا پردہ یوں فاش کیا ہے۔

بسا شادماں وہ دلہن کی طرف — چلا مثل بلبل کے گلشن طرف
وہ مہر جہاں نوشہ ذی شرف — کیا اس کے گھونگھٹ کو سب بر طرف
لگا کرنے نظارا ارمان سے — فدا اس پہ ہوتا تھا سو جان سے

مولوی سخاوت مرزا نے اپنے مضمون میں اس مثنوی کا میر حسن کی ''سحر البیان'' سے تفصیل کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا ہے اور جگہ جگہ پیشِ نظر مثنوی کے خوبصورت اشعار بھی نمونتاً

پیش کئے ہیں۔ انہوں نے اشمہ آرکاٹی کی زبان وبیان کی بے پناہ قدرت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ میری رائے ہے کہ "سحر البیان" کے علاوہ جس قدر مثنویاں شعراء اہلِ کمال مثلاً دیا شنکر نسیمؔ "سعادت یار خان رنگین، غلام علی مہر وغیرہ نے لکھی ہیں۔ ان سب میں بلحاظ پلاٹ اشمہ کو تفوق حاصل ہے اور رنگینی بیان اور تسلسل میں کسی سے کم نہیں اور اس کی مثنوی اخلاقی کمزوریوں سے مبرا ہے۔ (۱۱)

اشمہ نے اس مثنوی میں نہ صرف مختلف مناظر فطرت کی دلچسپ مرقع کشی کی ہے بلکہ انسانی جذبات اور احساسات کی موثر تصویر کشی کی ہے۔ ایک طرف انہوں نے محلات کی بزم آرائی کا مفصل جائزہ لیا ہے تو دوسری طرف جنگی معرکوں اور زرمیہ واقعات کی بھی ترجمانی کی ہے۔ اس اعتبار سے اشمہ نہ صرف آرکاٹ کی بلکہ تاریخ ادب اردو کی قابلِ فخر شاعرہ ہیں۔

حوالہ جات

(۱) کاوش بدری، شہزادی اشمہ آرکاٹی کی مثنویاں۔ مطبوعہ " معارف" اگست ۱۹۹۶ء صفحہ ۱۱۳

(۲) افتخار فارسی اور عربی کے جیدّ شاعر تھے۔ آپ نے وفات مکہ معظمہ میں پائی۔

(۳) سواغاتِ ممتاز مطبوعہ (۱۳۸۰ھ م ۱۹۶۱ء) تالیف محمد کریم خیر الدین حسن الدولہ جلاوت جنگ۔

(۴) گلشنِ مہوشاں مصنفہ اشمہ کی تاریخ بھی کہی ہے۔

(۵) آپ کی شرح سکندر نامہ بھی بے حد مشہور ہے۔

(۶) مطبوعہ " معارف " اگست ۱۹۹۶ء صفحہ ۱۱۵

(۷) کاوش بدری اپنے مضمون میں اشمہ کی قلمی تصانیف کا تذکرہ کرتے ہوئے مختلف کتب خانوں کے حوالے بھی دئے ہیں جو گمراہ کن ہیں۔ مثلاً حیدر آباد سنٹرل لائبریری اور کتب خانہ حیدر آباد۔ جہاں تک راقم کی معلومات کا تعلق ہے حیدر آباد سنٹرل لائبریری کسی کتب خانہ کا نام نہیں ہے، البتہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری ضرور ہے جہاں صرف مطبوعہ کتابیں ہیں، آخر الذکر نام کا کوئی کتب خانہ حیدر آباد میں موجود نہیں ہے۔

(۸) اشمہ مدراس کی ایک جید شاعرہ " نوائے ادب" اکتوبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۳

(۹) صفحہ ۵۷ ماہر اشمہ آرکاٹی کے سب سے چھوٹے فرزند

(۱۰) اشمہ مدراس کی ایک جید شاعرہ " نوائے ادب" اکتوبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۸

(۱۱) نوائے ادب صفحہ ۳۰ مطبوعہ اکتوبر ۱۹۵۲ء

☆☆☆

سکینہ عرف اغناء صاحب

سکینہ بی مولانا مولوی عبد الوہاب مدار العمراء کی دختر تھیں۔ آپ کے شوہر قادر مرتضیٰ حسین سالار الملک بہادر محتشم جنگ (المتوفی ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ھ) تھے (۱)۔ آپ بمقام قربنِ کلس محل، مدراس ۱۵ شعبان ۱۲۵۱ھ مطابق ۶ دسمبر ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی شادی ۲ جمادی الاول ۱۲۶۷ھ مطابق ۲ مارچ ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔

سالار الملک اپنے دور کے مشہور و معروف مدبر تھے۔ موصوف کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے سر سید احمد خان سے پہلے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی طرف ترغیب دلائی تھی۔ جس کا ذکر راقم نے نواب غوث خان اعظم کے مضمون میں تفصیلی طور پر کیا ہے۔ (۲)

سکینہ بی نے اپنے شوہر سالار الملک کی نگرانی میں دینی و ادبی و علمی ذوق کو پروان چڑھایا۔ سکینہ بی نے خاندانی اعزاز ورثے میں پایا تھا۔ اپنے والدِ ماجد اور چچا سے دینی تعلیم حاصل کی تھی۔ فنِ قرأت اور تجوید سے واقف تھیں۔ قرآنِ مجید کو صحیح مخارج کے ساتھ ادا کرنے کا بھر پور سلیقہ ان میں موجود تھا۔ (۳)

آپ نے بھی آمنہ بی کے ہمراہ معاشرہ کی اصلاح میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ آپ خطوط نگاری میں ایک خاص مقام رکھتی تھیں۔ موصوفہ کے خطوط آج بھی مخزن مدرسہ ء محمدی ہیں۔

آپ کی وفات ۲۲ رجب ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں بمقام مدینہ منورہ ہوئی اور تدفین جنت البقیع میں ہوئی۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : آپ نواب غلام غوث خان اعظم کے میر منشیٔ خاص تھے۔ صفحہ ۵۳۲ خانوادہء قاضی بدر الدولہ، از : مولانا کوکن مطبوعہ ۱۹۶۳ء

(۲) : ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب از : علیم صبا نویدی صفحہ ۲۶۴ مطبوعہ ۱۹۹۹ء

(۳) : خانوادہء قاضی بدر الدولہ از : مولانا کوکن صفحہ ۵۳۷ مطبوعہ ۱۹۶۳ء

حلیمہ بی

حلیمہ بی صاحبہ قاضی بدرالدولہ اور آمنہ بی کی دختر ہیں۔ آپ بمقام مدراس ۲۵ شوال ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی شادی ۲۶ رجب ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۸۵۲ء میں غلام محمد شرف الدولہ (جو آپ کے چچازاد بھائی اور عبد الوہاب مدارالامراء کے فرزند تھے) سے ہوئی۔ آپ بھی اپنی بہن حسینہ بی کی طرح عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم قاضی بدرالدولہ اور آمنہ بی سے حاصل کی تھی۔ آپ بھی اپنے دور کے خواتین میں اپنا ایک خاص مقام و مرتبہ رکھتی تھیں۔ لیکن ان کا ادبی ذوق حسینہ بی کی طرح اونچا نہیں تھا۔ علمِ طب میں اچھا خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ اللہ نے آپ کو دستِ شفا بھی عطا کیا تھا۔ خاندان کے تمام تر افراد آپ کے اس علم سے مستفیض تھے۔

مولانا کوکن نے آپ کے متعلق یہ اطلاع دی ہے " حلیمہ کو دینی علوم کی نشر و اشاعت سے بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ۲۶ رجب ۱۳۵۹ھ میں دیوان صاحب باغ میں عربی مدرسہء محمدی کی بنیاد رکھی گئی حلیمہ بی بی نے اس مدرسہ کی عمارت کے لئے موجودہ زمین وقف کی تھی۔(۱) اور یہ بھی وصیت کی کہ اگر آئندہ مدرسہ کے لئے ضرورت پیش آئے تو زمین کا ایک اور حصہ بھی مدرسے کے لئے دیا جائے۔" (۲) ۔ اس مدرسہ کے تعلق سے حلیمہ بی کا تفصیلی تذکرہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے ایک مضمون " مدرسہ محمدی اور اس کا پس منظر " میں لکھا ہے کہ شرف الدولہ کی اہلیہ نے اس مدرسہ کے لئے اپنا مکان اور اطراف کی بہت سے زمین وقف کی۔(۳)

تقریباً پچاس سال پہلے حلیمہ بی کی وصیت کے مطابق ان کے پوتے ابو احمد عبد اللہ نے اس احاطے میں ایک اور عمارت تیار کی جس میں آج امانتی کتب خانہ قائم ہوا۔ اس امانتی کتب خانے کی تعمیر میں قائدِ ملت اسماعیل صاحب اور مولانا سید عبد الوہاب بخاری نے بہت اہم رول ادا کیا۔ گویا یہ

کہنا مقصود ہے کہ حلیمہ بی کا فیضان آج بھی جاری ہے۔

حلیمہ بی کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر اصلاحِ معاشرے پر خاص توجہ دی۔ شادی اور بیاہ کے رسومات کے رد کرنے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان کے ترکِ رسومات کے رویہ سے جہاں لحاتی طور پر بہت نقصانات ہوئے وہاں ایک بڑے گروہ کا فائدہ بھی ہوا۔ آخری عمر تک حلیمہ بی اپنے آدرش اور مقاصد میں مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔ یہ بھی ان کے اولوالعزمی کی روشن دلیل ہے۔

دینی درس و تدریس میں بھی ان کا خاص مقام تھا جس کا ذکر مختلف احباب نے ''مشیر نسوان'' میں اپنے اپنے مضامین میں کیا ہے۔ خطوط نگاری میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ ان کے خطوط بھی ''مشیر نسوان'' میں جگہ پا چکے ہیں۔

آپ نے کافی طویل پائی تھی۔ ڈاکٹر ذاکرہ غوث کا کہنا ہے کہ ان کا انتقال ستاسی ۸۷ کی عمر میں ہوا یعنی آپ کا انتقال ۹ رجب ۱۳۴۳ھ مطابق ۳ جنوری ۱۹۲۵ء میں ہوا اور مسجدِ والا جاہی میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : یادگار نمبر بتقریبِ جشنِ صد سالہ مدرسہ محمدی صفحہ ۷ مطبوعہ ۲۶ رجب ۱۴۰۹ھ
(۲) : خانوادہء قاضی بدر الدولہ از : مولانا محمد یوسف کوکن صفحہ ۴۹۹ مطبوعہ ۱۹۶۳ء
(۳) : یادگار نمبر بتقریبِ جشنِ صد سالہ محمدی صفحہ ۳۰ اور ۳۱ مطبوعہ رجب ۱۴۰۹ھ

حسینہ بی عرف بی صاحبہ

حسینہ بی قاضی بدرالدولہ اور آمنہ بی کی دختر تھیں۔ آپ بمقام مدراس ۱۵ رمضان ۱۲۶۲ھ مطابق ۲۷ اگست ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی تاریخ نکاح ۲۱ جمادی الاول ۱۲۷۴ھ مطابق ۸ جنوری ۱۸۵۸ء ہے۔ ان کی شادی اپنے چچازاد بھائی محمد غوث انتقام خان سے ہوئی تھی۔

حسینہ بی کے دور میں خواتین کی تعلیم و تربیت کا رواج مطلق نہیں تھا۔ اس کے باوجود موصوفہ نے عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم خود اپنے والدِ بزرگوار قاضی بدرالدولہ سے حاصل کی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے انگریزی زبان بھی سیکھی۔ عربی زبان اور فارسی زبان پر اتنی دسترس حاصل تھی کہ بہت ساری کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا۔ عربی کی کتابوں میں ان کی ترجمہ شدہ کتاب ''الترغیب والترہیب'' بے حد مشہور ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ان کی عربی دانی کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ عربی زبان میں ان کی بہترین اور عمدہ صلاحیتوں کا بھی ادراک ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک اور کتاب کا ترجمہ '' رسالہء مسواک'' کے نام سے مرتب کیا ہے جس کا اصل متن عربی تھا۔ '' انجمنِ اصلاح العشیرہ'' حیدرآباد نے اس کتاب (۱) کو زیورِ طباعت سے آراستہ کیا تھا۔ اس کتاب کے نسخے آج نایاب ہیں۔ راقم نے اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ ڈاکٹر ذاکرہ غوث صاحبہ کے ہاں دیکھا تھا۔ حال ہی میں اس کتاب کو دوبارہ ترتیب دے کر حسینہ بی کے پرنواسے صفی الدین محمد یعقوب صاحب نے محمد عبیداللہ زبیر کی ایماء پر شائع کیا ہے۔ (۲)

حسینہ بی نے ایک اور کتابچہ بنام '' رسالہ عقدانامل '' لکھا جس میں اللہ کے نام ایک ہزار تک انگلیوں کے پوروں پر پڑھنے کا طریقہ درج ہے۔ یہ مختصر سا رسالہ بھی ان کے خاندانی کتب خانے میں موجود ہے۔ (۳)

حسینہ بی اردو خطوط نگاری میں بھی کافی نام پیدا کر چکی ہیں۔ ان کے اکثر خطوط '' مشیر

نسوان'' (۴) شائع ہوئے ہیں۔ جس کا ذکر بطورِ خاص ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے اپنی کتاب '' قاضی بدر الدولہ کے خواتین کی علمی خدمات '' میں کیا ہے اور ان کے خطوط کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔

حسینہ بی کی بہت سی اہم خصوصیات میں ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تصوف اور سلوک کی منزلیں بھی غائبانہ طور پر طے کی ہیں۔ مولوی حافظ محمد یوسف کوکن مرحوم نے اپنی کتاب خانوادہء بدر الدولہ میں ان کے علمِ ظاہری وباطنی پر روشنی ڈالتے ہوئے تفصیل سے لکھا ہے (۵)

حسینہ بی علمِ طب میں بھی مہارتِ تامہ رکھتی تھیں۔ خود ان کے خاندان کی عورتیں اور بچے ان کے طبّی مشوروں اور خود کی تیار کردہ ادویات سے مستفیض تھیں۔

مولانا محمد مظہر صاحب نے '' مشیر نسوان'' کے ایک مضمون میں یہ اطلاع دی ہے کہ موصوفہ کو عربی ادب اور شاعری سے بھی خاصہ لگاؤ تھا۔

آپ کا انتقال ۳۰ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ مطابق ۳ نومبر ۱۸۹۱ء میں ہوا۔

حوالہ جات

(۱) : اس کتاب میں چالیس احادیث کا ترجمہ موجود ہے۔
(۲) : اس کتاب میں صرف تیئیس ۲۳ احادیث کا ترجمہ ہی جگہ پائے ہیں۔
(۳) : بدرالدولہ از: حافظ محمد یوسف کوکن صفحہ ۵۰۳ ،
(۴) : یہ خاندانی قلمی رسالہ ہے جس میں قاضی بدر الدولہ کے خاندانی کارنامے موجود ہیں۔
(۵) خانوادہء قاضی بدر الدولہ از: مولانا یوسف کوکن عمری صفحہ ۴۹۹ تا ۵۰۳ مطبوعہ ۱۹۶۳ء

خاتون بی بی عاجزہؔ

ٹمل ناڈو کی سر زمین سے بہت ساری خواتین شاعرات اُبھریں اور اردو ادب پر اپنا بھر پور نقش ثبت کیا ہے۔ ان میں چند ایک شاعرات خانوادہء نوابین آرکاٹ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف علاقوں کے علمی گھرانوں میں ایسے چراغ باربار روشن ہوتے رہے۔ خاتون بی بی عاجزہ نے ایسی ہی ایک علمی گھرانے میں اپنی آنکھ کھولی تھی۔ یہ خاندانِ سعادت سے تھیں۔ ان کے والدِ محترم کا نام سید محی الدین تھا جن کی چھ اولادیں تھیں جن میں سب سے بڑی خاتون بی بی عاجزہ ہی تھیں۔ باقی تمام پانچوں بھائی تھے۔ ان کے بھائیوں کے نام سید عبد الغفور، سید عبد الطیف، سید عبد العزیز، سید عبد الوہاب اور سید عبد الحمید ہیں۔ عاجزہ اپنے باپ کی بہت چہیتی تھیں اور انہیں اپنے ایک بھائی سید عبد الوہاب سے بڑی انست تھی جنہوں نے دس سال کی عمر میں قرآنِ شریف حفظ کر لیا تھا۔ ان کی پیدائش ترچنا پلی میں ہوئی جہاں قطبِ وقت حضرت شاہ طبلِ عالمؒ کا آستانہ ایک عالم کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہے۔ آپ کے والدِ بزرگوار بہت بڑے عالم دین تھے۔ جنہوں نے خود ہی اپنی دختر کو بہترین دینی تعلیم دی اور خصوصاً عربی، اردو اور فارسی جیسی تینوں زبانوں میں بھر پور قابلیت کے جوہر عطا کئے۔ مزید توجہ کے لئے حضرت مولانا محمد عاصیؔ سے عاجزہ کی ذہنی تربیت کو ضروری سمجھا۔ چونکہ موصوف عربی، اور فارسی تینوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے اور ترچنا پلی میں اُس دور میں اُن کے پایہء کا دوسرا کوئی استادِ فن موجود نہیں تھا۔ شاعری کے علاوہ عاجزہ نے حضرت شیخ سعدیؒ کی تصنیفات کا درس حضرت عاصیؔ سے لیا تھا۔ ان کی تاریخِ پیدائش کا کسی ذریعہ سے پتہ نہیں چلتا۔ غالباً یہ داغؔ اور امیرؔ مینائی کی ہم عصر رہی ہوں۔ کیونکہ حضرت امیرؔ مینائی کے شاگرد جناب سید علی صاحب قادری بہارؔ ساکن اودگیری نے عاجزہؔ کے نعتیہ دیوان " تحفہء قبول " پر ایک قطع تاریخ کہا ہے اور وہ اس دیوان میں موجود ہے۔

عاجزہ نے یہ بڑا کام کیا — واہ کیا نظمِ معظم لکھی
سن کہا بے سرِ اعدا میں نے — مدحتِ رحمتِ عالم لکھی

1305ھ

اگر موصوفہ کی عمر اُس وقت لگ بھگ تیس پینتیس سال کی رہی ہو تو غالباً ان کی پیدائش 1275ھ کے قریب رہی ہے۔

عاجزہ اپنے دور میں بہت زیادہ معروف رہی ہوں گی۔ کیونکہ اس دیوان میں ترچنا پلی اور مدورا کے شعراء کے علاوہ دیگر مقامات کے شعراء نے بھی قطعات پیش کئے ہیں جن میں حضرت اصمعی پھلری، حضرت شریفؔ مدراسی اور مولانا ماہرؔ حیدر آبادی کے نام گرامی قابلِ غور ہیں۔

ٹمل ناڈو کی خواتین شعراء نعتوں کی طرف بہت زیادہ مائل رہا کرتی تھیں۔ عاجزہ بھی نعتوں ہی کی طرف کشاں کشاں چلی گئیں۔ کیونکہ اُن کا رجحان مذہبی تھا۔ عشقِ رسولِ اکرم ﷺ ان کی نعتوں سے خوب چھلکتا ہے۔ ان کا خود یہ کہنا ہے کہ حضورؐ سے اُس وقت انہیں محبت و عقیدت ہوئی جب کہ ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ کہتی ہیں۔

عشق ہے طفلی سے مجھ کو سرورِ عالمؐ ترا
غم نہ تھا دنیا کا جب تب سے لگا ہے غم ترا

عاجزہ کے والدین بھی غریب تھے اور جس گھرانے میں ان کا بیاہ ہوا وہ گھرانہ بھی غیر متمول تھا۔ اس لئے درِ اقدسؐ پر جانے کی بھرپور تمنا کبھی پوری نہ ہوئی اور وہ اس غم و جدائی میں زندگی بھر گھٹتی رہیں۔ اس غم و ہراس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

وصفِ دلبر سے دل کو تھی راحت — مدح سرور سے جاں کو تھی فرحت
ایک ساعت نہ تھا قرار مجھے — ذکرِ اقدس و فکرِ مدحت سے
یادِ محبوبؐ جب کہ ہوتی تھی — مل زمیں پر جبیں کو روتی تھی
اور کہتی تھی اے مرے حضرتؐ — تم کہاں اور کہاں یہ بد قسمت
ہائے! وہ دن کہاں کہ آؤں میں — سنگِ زینہ پہ سر جھکاؤں میں
رنج ہجراں میں یادِ وصلِ نبیؐ — باعثِ زندگی رہی میری
ہوتا تھا دردِ ہجر جب بسیار — لکھتی تھی شوقِ وصل کے اشعار

مذکورہ بالا اشعار میں جو روانی اور سلاست ہے وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ یہ کلام کسی شالی

ہند کے شاعر کے ہم پلہ رکھا جاسکتا ہے اور فخر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں بھی کیسی کیسی گہر بار خواتین شعراء گذری ہیں۔

عاجزہؔ کی نعتیہ شاعری کا مقصد دردِ ہجر رسولِ کریم ﷺ کو کم کرنا اور شوقِ وصل کو تصور ہی تصور میں پورا کرنا تھا۔ ان کا آخری شعر ملاحظہ فرمایئے کہ وہ جب کبھی ہجر رسولؐ میں تڑپتیں تو نعت گوئی کا سہارا لیتیں۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ شعراء حضرات نعت گویوں میں خود کو شمار کرنے کے لئے بغیر عشقِ رسولؐ کے بھی فضا میں اپنے پر پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔

عاجزہؔ زبان و فن کی خوبیوں سے پوری طرح واقف تھیں۔ ان کے ہاں رعایت لفظی بہت اہم تھی۔ وہ بے جا الفاظ کی بھر مار سے اپنے کلام کو پاک رکھنا جانتی تھیں۔ خصوصاً نعت گوئی میں الفاظ کے استعمال میں بہت محتاط رہنا چاہئے۔ اس ضمن میں حضرت شریفؔ مدراسی نے عاجزہ کو ایک قطعے میں یہ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

کیا خوب عاجزہ کا ہے دیوانِ نعتیہ — ہر ایک لفظ شامل حالِ رسولؐ ہے
حسب الطلب شریف نے بے ساختہ کہا — سالِ خوش اُس کا ذکر جمالِ رسولؐ ہے

1305ھ

عاجزہؔ کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں سادگی اور پُرکاری دونوں بیک وقت موجود ہیں مگر انکساراً انہوں نے خود کو ایک ناچیز شاعرہ ہی قرار دیا ہے، کہتی ہیں۔

گر نظر آئیں اس میں سہو و خطا — از عنایات و لطف و جود و عطا
قابلو! اس کی کیجئے صحت — نظرِ عیب جوئی کیجئے مت

اس اعتراف کے بعد بھی ہمیں عاجزہؔ کہیں کم تر دکھائی نہیں دیتیں۔ بعض جگہ پر کوئی سہو اگر ہوئی بھی ہو تو وہ قابلِ گرفت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ معاملہ نعتوں کے تعلق سے ہے۔ اگر اردو شاعری کی دوسری اصناف ہوتیں تو یقیناً اس کی طرف مبصر کا دھیان ضرور چلا جاتا۔ حد درجہ سادگی سے کام لیتے ہوئے ہی عاجزہؔ نے نعت گوئی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ ان کا یہ انداز ملاحظہ کیجئے :

فراقِ محمدؐ کی کیا بے کلی ہے — ہو کیوں مجھ کو راحت یہ دردِ دلی ہے
دکھا دیدار اے رشکِ مسیحا — تڑپتا ہے دلِ بیمار میرا
منوّر کیوں نہ ہو دل جب کہ رہبر — ہے عشق روئے پُر انوار میرا

جب نہ بیداری میں ہو حضرت کی صورت دیکھنا
عالمِ رویا میں کب ہوتی ہے رویت دیکھنا
ذائقہ دردِ جدائی کا بہت ہم پا چکے
دل میں ہے اب لذتِ دیدارِ حضرت دیکھنا

یادِ نبیؐ ہے ایمان میرا روئے نبیؐ ہے قرآن میرا
مداح جب سے ہوں شاہِ دیںؐ کی ہے مدح گوہر انسان میرا

عاجزہؔ کا مطبوعہ دیوان اب نایاب ہے۔ کہیں کہیں ان کے کچھ بکھرے ہوئے اشعار مل جاتے ہیں۔ کاش ان کا پورا کلام روبرو ہوتا تو قارئین کے لئے بہترین نمونہ پیش کیا جاتا۔ ان کے ایک شعر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی ہادی و مرشد کے دستِ مبارک پر بیعت کا فیض حاصل کر چکی ہیں۔

الفتِ دو جہاں سے دل چھوٹا جب سے ہمراز سر مرشد ہوں

ترچنا پلی کے آستانہ میں معلوم نہیں اُس وقت کون بزرگ تھے جنہوں نے عاجزہؔ کو راہِ ہدایت سے مستفیض کیا تھا۔ دیوان کی طباعت میں بھی سوانح شاعرہ پیش کرنے میں کوتاہی برتی گئی ہے۔ کاش ایسا ہوتا تو ایک معتبر ادبی تاریخی دستاویز ہمارے ہاتھوں میں ہوتی۔ اکثر اکابر شعراء کے معاملے میں مرتبین نے اس طرح کی کاہلی سے کام لیا ہے۔ خصوصاً ٹمل ناڈو میں یہ روایتِ ناشائستہ ہمیشہ دیکھنے میں آئی ہے۔ ☆☆☆

امتہ الرحیم

آپ غلام محمد شرف الدولہ کی دختر تھیں۔ آپ بمقام مدراس ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی شادی اپنے ماموں زاد بھائی مولوی محمد عبد اللہ (فرزندِ قادر مرتضیٰ حسین سالار الملک) کے ساتھ ہوئی۔ آپ میں علمی وادبی ذوق اپنی خاندانی خواتین کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا۔ آپ نے بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا ہے۔ آپ کے بہت سارے مضامین "عون الاطفال" (۱) میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کے بعض مضامین "واقعاتِ خاندانِ قاضی بدر الدولہ" کے متعلق "مشیر نسوان" میں جگہ پا چکے ہیں۔

قاضی بدر الدولہ اور حضرت مدار الامراء ہر دن شب و روز واقع ہونے والے حالات کا جائزہ تحریر کرنے کے عادی تھے۔ ان دونوں حضرات کے انتقال کے بعد بھی اس سلسلہ کو امتہ الرحیم نے بھی جاری رکھا۔ اس طرح کے "روزنامچے" آج بھی کتب خانہء مدرسہ محمدی اور اماتی کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان "روزنامچوں" کا حوالہ مولانا محمد یوسف کوکن نے بھی اپنی کتاب "خانوادہء قاضی بدر الدولہ" میں یوں دیا ہے۔

"اس خاندان میں مولوی عبد الوہاب مدار الامراء پہلے شخص ہیں، جنھوں نے یکم جمادی الثانی ۱۲۳۶ھ مطابق ۲ مارچ ۱۸۲۱ء سے اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اُس کے بعد یکم محرم ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۸۳۴ء سے اُن کے چھوٹے بھائی انے اپنا "روزنامچہ" لکھنا شروع کیا۔ جو اُن کی وفات سے چار دن پہلے دن تک جاری رہا۔ آپ کی وفات کے بعد ان کے فرزند مولوی حاجی مفتی محمد سعید نے "روزنامچہ" لکھنا شروع کیا۔ اس طرح یہ سلسلہ اس خاندان میں جاری رہا"۔ (۲)

امتہ الرحیم نے یہ "روزنامچے" اردو اور فارسی میں لکھے ہیں جو کتب خانہء مدرسہ

محمدی کے مخزونہ ہیں۔ موصوفہ کا یہ مشغلہ آپ کے انتقال سے پندرہ دن پہلے تک جاری رہا۔

آپ کا انتقال ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں حیدر آباد میں ہوا۔ اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : "عون الاطفال" ایک قلمی رسالہ تھا جو خاندانی بچوں میں گشت کرتا تھا

(۲) : خانوادہء قاضی بدر الدولہ از : مولانا کوکن صفحہ ۱۱ مطبوعہ ۱۹۶۳ء

عباسی بیگم

عباسی بیگم کی پیدائش غالباً ۱۸۸۱ ء میں وانم باڑی، ضلع شمالی آرکاٹ میں ایک تعلیم نسوان کے بھرپور حامی اور درد مند گھرانے میں ہوئی۔ آپ کے والد بھی وسیع النظر اور تعلیم نسوان کے بانی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی لڑکیوں عباسی بیگم اور رابعہ سلطانہ دونوں کو بہت اچھی تعلیم سے مزین کیا تھا۔ اسی تعلیم کے نتیجے میں دونوں بہنیں دنیائے اردو میں بہت نامور ہوئیں۔ اور خصوصاً عباسی بیگم کا مقام رابعہ سلطانہ سے بلند تھا۔ ایک طویل مدت تک عباسی بیگم " تہذیبِ نسواں"، " مخزن"، "خاتون"، " النساء"، "زمانہ" اور " تاج" وغیرہ میں نہ صرف بیش بہا مضامین شائع کراتی رہیں بلکہ بحیثیت شاعرہ بھی انہوں نے اپنی نظمیں پیش کی ہیں۔ جن سے شعر گوئی پر اُن کی قابلیت اور گرفت کا بھی بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ " گلِ صحرا" اُن کی ایک شعری تصنیف ہے۔ نثر و نظم دونوں میں وہ دل کھول کر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتی ہیں۔ اُن کی نظم کا ایک نمونہ حسبِ ذیل ہے۔

خودی سے باز آ، نہ خوار ہو تو، خدا کے بندے خدا خدا کر
خدا کا رستہ ہے صاف سیدھا، ادب سے چل سر جھکا جھکا کر
کہاں وہ دولت، کہاں حمیّت، کہاں وہ ہمت کے کارنامے
ہماری پستی نے ہائے ہم کو گھٹایا آخر بڑھا بڑھا کر
اٹھو بڑھو اب کرو نہ سستی، رہے بہت محوِ خوابِ غفلت
بہت سی طے کرنی ہیں منازل، قدم بڑھاؤ جما جما کر
یہی ہے عباسیؔ ہم کو حسرت، یہی ہماری ہے رب سے خواہش
کہ قوم سرسبز ہو ہماری، جہاں پہ سکہ جما جما کر (۱)

اس دور کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو عباسی بیگم کی شاعری صالح روایاتی قدروں کی

بھر پور غماز تھی۔ حالانکہ ان کے ہم عصر شعراء میں مولانا عبدالمجید شرر آلندوری، مولانا ابو بکر نظمی، حضرت فہیم آموری، مولانا آسی ترپاتوری، اور غلام حسین دلیل مدورائی نے بھی کلاسیکی شاعری کو اپنے اظہار کا ماخوذ منبع بنایا تھا۔ لیکن کہیں کہیں ان شعراء نے شاعری کے جدید تقاضوں کو بھی شعوری طور پر اپنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن عباسی بیگم کا شعری مطالعہ شاید اقبال تک محدود تھا۔ اس لئے انہوں نے نہ غزل کی طرف توجہ دی اور نہ اپنے دور کے جدید میلانات کو اپنایا۔

ان کی نثر کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:

"کملا تو مرجھا کیوں گئی؟ میری چندا روپ کملا تونڈھال کیوں ہوگئی؟ میں سمدہن سے پوچھوں گی امراؤ سنگھ ترے پتی سے پوچھوں گی کہ تجھے کس نے مرجھایا، کس نے دیکھا" (۲)

عباسی بیگم کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہوا اور وانم باڑی ہی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

عباسی بیگم کی بہن رابعہ سلطانہ بھی اپنی بہن کی طرح خود کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مگر اُن کا میلان شاعری سے زیادہ نثر کی طرف تھا۔ غالباً ان کے مضامین "تہذیبِ نسوان" ہی میں جگہ پاتے رہے تھے جس کے نمونے راقم کی دسترس سے باہر ہیں۔ اتنا یقین ہے کہ وہ بھی انہیں رسالوں میں اپنی تخلیقات شائع کراتی رہی ہوں گی جن رسالوں میں عباسی بیگم کی تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں۔

تقریباً انہیں کے دور میں "عصمت"، "تہذیبِ نسوان"، "النساء" جیسے مقتدر جرائد میں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۰ء تک ذیل کی خواتین ادباء پوری طرح فعال اور متحرک تھیں اور آئے دن ان کی نثری تخلیقات چھپتی رہتی تھیں۔

۱۔ آنسہ ب۔ ن۔ ابراہیم   ۲۔ ایچ۔ احمدی بیگم   ۳۔ محبوب بیگم

۴۔ آنسہ ایس یعقوب   ۵۔ مسز عباس علی۔

مذکورہ بالا خواتین سے متعلق مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "خواتینِ مدراس کی اردو شاعری اور نثر نگاری" میں حوالے دئے ہیں۔ (۳)

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : مطبوعہ رسالہ "تاج" حیدر آباد

(۲) : تذکرہ جمیل۔ از: عبدالرزاق بسمل حیدر آبادی حصہ اول (مطبوعہ ۱۹۴۰ء)

(۳) : خواتینِ دکن کی اردو خدمات از: نصیر الدین ہاشمی صفحہ ۲۸۰، ۲۷۹، ۲۷۸ (مطبوعہ ۱۹۴۰ء)

نعیمہ بیگم

آپ بمقام مدراس ۱۸ شوال ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۸۸۳ء پیدا ہوئیں۔ آپ قادر مرتضیٰ حسین سالار الملک کی پوتی مولوی غلام محمد اور شرف الدولہ کی نواسی تھیں۔ آپ کے والد مولوی محمد غوث تھے۔ چونکہ آپ کا گھرانہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اسی گھریلو ماحول میں آپ کی ذہنی پرورش و پرداخت ہوئی۔ نعیمہ بیگم کے بھائی نے ان کی تربیت میں بڑا خاص رول ادا کیا ہے اس زمانے میں خواتین کی تعلیم کو معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ قدیم روایات کے پابند دور میں مولوی علی محمد کا کارنامہ یہ ہے کہ موصوف نے اپنے خاندانی خواتین کو تعلیم یافتہ بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ گویا انہوں نے اپنی چار نسلوں کو بھرپور دینی و علمی زیور سے آراستہ کیا ہے۔ مولوی علی محمد کے بعد بھی اس سلسلے کی کڑیوں کو قائم رکھنے میں نعیمہ بیگم پیش پیش تھیں۔ آپ کو فنِ حکمت بھی ورثے میں ملا تھا۔ عورتوں اور بچوں کے علاج میں بہت زیادہ مہارت حاصل تھی۔ آپ نے فنِ طب پر کئی ایک مضامین لکھے ہیں، جو " مشیر نسوان" میں جگہ پا چکے ہیں۔ ان مضامین سے اتنا ضرور انداز ہوتا ہے کہ بچوں کی بیماریوں کی تشخیص میں آپ کو دسترس حاصل تھی۔ آپ اپنے وقت کی بہترین نباض بھی ثابت ہوئیں۔ خطوط نگاری مین بھی آپ نے بڑا نام پیدا کیا۔ آپ کے بہت سارے خطوط اما نتی کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ آپ نے زندگی بھر درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنایا۔

آپ کا انتقال ۱۲ شوال ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۴ء کو مدراس میں ہوا اور تدفین حضرت دستگیر صاحب (عبدالحق ساویؒ) کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ ☆☆☆

نواب بیگم امتہ الحی مبشر النساء بیگم حیاؔ

مبشر النساء بیگم حیاؔ کی پیدائش غالباً 1886ء میں مدراس میں ہوئی۔ ان کی صحیح تاریخِ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ قیاس اس لئے ہے کہ ان کی والدہ محترمہ کا انتقال 1905ء میں ہوا تھا۔ ان کی شادی حضرت ایمان گوپا موی سے غالباً 1883ء میں ہوئی۔ شادی کے تیسرے یا چوتھے سال آپ کی دوسری اولاد کی حیثیت سے مبشر النساء بیگم حیاؔ ہی کا نام کیا جاتا ہے۔

مبشر النساء بیگم حیاؔ نواب غلام محمد علی خان پرنس آف آرکاٹ پنجم کی اہلیہ تھیں۔ حیاؔ کا تعلق نواب ایمان گوپا موی کے اعلیٰ نسب خاندان سے ہے اور یہ پورا خانواہ علمی، مذہبی، ادبی اور اخلاقی اعتبار سے بہت معروف و مقبول تھا۔ یقیناً مبشر النساء حیاؔ کی تعلیم و تربیت اعلیٰ اصولوں پر ہی ہوئی ہوگی۔ اردو شاعری تو آپ کو وراثت میں ملی ہے۔ آپ اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔ ان دونوں زبانوں میں آپ کے کلام کے نمونے ملتے ہیں۔ آپ کا خصوصی طور پر نعت و منقبت کہنے کی طرف بہت زیادہ رجحان تھا۔ مگر اور اصناف میں آپ کا کلام ابھی تک نظر سے نہیں گذرا۔ ایک شاعرہ ہونے کی حیثیت سے زبان کا تلذذ حاصل کرنے کی خاطر آپ نے نظموں، غزلوں، مثنویوں، جیسی اصناف کو برتنے کی طرف بھی دھیان دیا ہوگا۔ آپ کا نعتیہ کلام (شاید منتخب کلام ہو) بعنوانِ " خم خانہ ء محامد" (مطبوعہ 1970ء) حضرت پروفیسر محبوب پاشا صاحب فرزندِ ایمان گوپا موی نے شائع کرا کے ایک بہت بڑا ادبی احسان کیا ہے۔

آپ کا تخلص حیاؔ یا نام حیاؔ بہ مناسب " الحیاء من الایمان" طے پایا ہے۔ اول یہ کہ آپ کے والد ایمانؔ کے تخلص سے معروف تھے۔ دوم یہ کہ حیاؔ کو ایمان کا ایک جز قرار دیا جاتا ہے۔ نام کے انتخاب سے ہی اُس خاندان میں علم کی قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے۔

" خم خانہ ء محامد" میں بڑی اور چھوٹی دونوں بحروں دونوں میں حیاؔ نے اشعار کے

ہیں۔ حیا کی نعتوں میں ایک خاص بات یہ پائی جاتی ہے کہ ان میں عشق رسولِ پاک ﷺ بدرجہ اتم موجود ہے۔ فارسی شاعری سے اثر لیتے ہوئے ان کے ہاں حضور اکرم ﷺ کو بھی تو کی ضمیر سے خطاب کیا گیا ہے۔ یہ محض ضرورت شاعری کی بنا پر ہے۔ ورنہ ان کی نعتوں میں خطاب بصد احترام بھی ملتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

یارسول اللہ خدا دکھلائے جلوہ آپ کا
ہے نہایت دل مرا مشتاق وشیدا آپ کا

دکھادے یا خدا جلوہ رُخِ پر نور حضرت کا
شرف ہو جائے حاصل کاش رویا ہی میں رویت کا

سیدِ کونین ختم المرسلاں شاہِ حجاز
سرورِ دارین سلطانِ جہاں شاہِ حجاز

اسمِ اعظم جس کو کہتے ہیں وہ ہے نام آپ کا
اُس کو مقصد مل گیا جس نے پکارا یا رسولؐ

ان اشعار میں کہیں بھی ادنیٰ ضمیر کا استعمال نہیں کیا گیا مگر " تو اور تم " کے خطابات میں بھی خلوص و عقیدت ہی چھلکتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے :

یا نبیؐ کعبے سے بڑھ کر ہے مدینہ تیرا
سنگ اسود ہے وہاں اس میں ہے روضا تیرا
لقب ہے کس کا حبیبؐ خدا تمہارے سوا
رسولؐ کون ہے ایسا بھلا تمہارے سوا

تم مقتدا، تم مقتدر تم رہ نما، تم راہ بر
تم دادرس، تم دادگر کچھ رحم میرے حال پر

ان کا سارا کلام عشقِ رسولؐ سے لبریز نظر آتا ہے۔ کہیں بھی محض شعر گوئی کے لئے انہوں نے نعتیں نہیں کہی ہیں۔

کل بھی وہ دردِ عشق تھا دل میں جو آج ہے
بیمار مصطفٰےؐ کا مرض لا علاج ہے

اٹھیں گے ہم مزار سے کہتے ہوئے یہی
چلئے رسولِ پاک کا دیدار آج ہے
وہ الفت ہے محمدؐ کی جسے ایمان کہتے ہیں
خدا کی آشنائی ، آشنائی مصطفٰےؐ کی ہے
نہ دیجئے مجھے اے شاہِ دَوسرا کچھ بھی
بجز تمہاری محبت کے دُوسرا کچھ بھی

مندرجہء بالا شعر میں '' دَوسرا '' اور '' دُوسرا '' کے استعمال سے شعر کو اعلیٰ فنی محاسن پر پہنچادیا ہے :

کسی سے کیا ہے غرض آپؐ کے فدائی کو
وہ چاہتا ہی نہیں آپؐ کے سوا کچھ بھی
ہے دردِ عشق نبیؐ کی شفا نبیؐ کے ہاتھ
مسیحؑ آپ سے ممکن نہیں دوا بھی
ہے اگر خواہش بقا کی اے حیاؔ
عشقِ احمدؐ میں فنا ہو جایئے

کہتے ہیں کہ حیاؔ کا انتقال ارضِ پاکؐ پر ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اس کی مناسبت سے حیاؔ کا یہ شعر پھڑکا دیتا ہے۔؎

جان اپنی کیجئے شہؐ پر نثار　　　چل کے روضہ پر فدا ہو جایئے

عشقِ محمدیؐ میں حیاؔ کی سرشاریت قابلِ غور ہے : ؎

تاریکیء لحد میں ہمارے لئے حیاؔ　　　عشقِ نبیؐ کے داغ کا روشن چراغ ہے

حیاؔ کی طرح کی عظیم نعتیہ شاعری کسی بھی خاتون شاعرہ کے ہاں بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں اظہار کی روانی، الفاظ کا انتخاب اور نشست، الفاظ کی سلاست جیسی تمام خصوصیات ملتی ہیں۔ الفاظ کی کھینچ تان کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ خواہ وہ چھوٹی بحروں کی نعتیں ہوں یا بڑی بحروں کی...... ان اشعار پر قاری ضرور داد دے گا، ملاحظہ کیجئے۔

خوشا قسمت! نظر آئے گا جو توؐ بے حجابانہ
ترےؐ شیدا کو گویا عید کا دن روزِ محشر ہے

مزا ملتا نہیں ہے زندگی کا ہند میں ہم کو
ہزاروں موت سے بڑھ کر جدائی مصطفےٰؐ کی ہے
جان ہو جائے مری پائے نبیؐ پر صدقے
خواب ہی میں نظر آجائے جو صورت انؐ کی
کبھی گر خواب ہی میں جلوہ دکھلادیں حضورؐ اپنا
تو یہ سوتی ہوئی قسمت مری بیدار ہو جائے

نعتوں کے علاوہ انہوں نے منقبتیں بھی کہی ہیں۔ ایک قدرے طویل نظم بعنوان "معراج نامه" حیاؔ کا ایک شاہ کار ادبی کارنامہ ہے۔ یہ نظم مسدس کی ہیئت میں ہے۔ کل سترہ بند پر "معراج نامه" مکمل کیا ہے۔ اس نظم کے دو بند نمونتاً ملاحظہ ہوں۔

پھر چلے سوئے افلاک خیر الوریٰ
شور "یا ربی صل علیٰ" کا مچا
حور و غلماں، ملک، مرسل و انبیاء
بہر نظارہ تھے آپؐ پر سب فدا
اپنی جانوں کو قربان کرنے لگے
پائے اقدس پہ سر اپنا دھرنے لگے

ہیں تمہارے حوالے شقی و سعید
تم کو دی ہم نے خلد و سقر کی کلید
اپنے یاروں کے گھر کی کرو جاکے دید
اپنے بد خواہوں کی دیکھو جاکے پلید
اپنے بندوں کو سونپا تمہیں مصطفےٰؐ
جو تمہارا ہوا وہ ہمارا ہوا

اس مجموعے میں منقبتوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے :

سجدے میں وقتِ ذبح عبادت تمام کی
کیا شان تھی حسین علیہ السلام کی
بے کس حیاؔ کو اے شہِ جیلاں ترے سوا
کوئی جہاں میں حامی و داور نہیں ملا

پھونک دیتی ہے تنِ مردہ میں بھی روح نئی
تیرے کوچے کی ہوا حضرتِ غوث الثقلین

جہاں اقطاب بھی آ آکے کرتے ہیں جبیں سائی
وہ سنگِ در ہے وہ چوکھٹ ہے حضرت غوثِ اعظم کی

ذاتِ والا سے شانِ مصطفویؐ
سر بہ سر ہے عیاں غریب نواز

مجموعہ کلام کے آخر میں حسبِ معمول فارسی اور اردو میں حضورِ اکرم ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں حیاؔ نے سلام کہے ہیں۔ ایک سلام منقبتی انداز کا ہے۔ ذیل میں اس نوع کے کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

اے نورِ حق سراپا میرا سلام لیجئے
محبوبِ ربِ یکتا میرا سلام لیجئے
اے غمزدوں کے والی، اے رہنمائے عالی
اے بے کسوں کے مولا، میرا سلام لیجئے
اے رحمتِ مجسم، اے دستگیر عالم
اے تاجدارِ طٰہٰ، میرا سلام لیجئے
یہ آپ کا ہے رتبہ، کہتا ہے حق تعالیٰ
میرے حبیب والا، میرا سلام لیجئے
مادر پدر بھی میرے، جان و جگر بھی میرے
تم پر فدا ہوں شاہا، میرا سلام لیجئے
پیہم یہ انکساری ہے التجا حیاؔ کی
اے بادشاہِ بطحا، میرا سلام لیجئے

بہر حال حیاؔ نے بڑی حد تک با مقصد شاعری کی ہے اور وہ مقصد کونین کے حسنات کا حصول ہے۔ ان کی وفات 28 ذیقعدہ 1380ھ / مطابق 1961ء کو سرزمینِ عرب میں ہوئی اور جنت معلیٰ میں تدفین عمل آئی۔☆☆☆

امتہ العزیز بیگم

آپ قاضی بدرالدولہ اور آمنہ بی کی پوتی ہیں۔ اور مولوی محمد خلیل اللہ کی دختر تھیں۔
آپ بمقام مدراس ۱۵ رجب ۱۳۰۳ ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے ماموں زاد
بھائی مولوی رضی الدین مرتضےٰ کے ساتھ آپ کی شادی ہوئی۔

آپ کی ابتدائی تعلیم خود اپنے والدین کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ عربی، فارسی اور اردو میں
ید طولیٰ حاصل تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے مضمون " مدرسہ محمدی کا پس منظر " میں لکھا ہے کہ اُن
کی بہن امتہ العزیز عربی زبان میں مہارتِ تامہ رکھتی تھیں۔ (۱)

آپ نے عربی اور فارسی کی کئی ایک کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جن میں حسبِ ذیل
کتابیں مشہور ہیں۔

۱۔ " ہدایت الناظرین"

فقہ ء شافعی سے متعلق یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے جو آج تک غیر مطبوعہ ہے۔ (۲)

۲۔ " حالاتِ امام المدرسین"

یہ کتاب بھی اردو میں ترجمہ کرنے کے بعد شائع ہونے سے رہی۔

۳۔ " جامع الحکایات " (اردو ترجمہ)

یہ ایک فارسی کتاب ہے جس میں بزرگانِ دین کے فقر و فاقہ اور استقامتِ دین کے
حالات کئی ابواب میں تحریر ہیں۔

"جامع الحکایات" کا اردو ترجمہ " مشیر نسوان" میں چودہ قسطوں میں شائع ہو چکا ہے۔

امتہ العزیز نے نہ صرف اردو ترجمہ کی طرف خاص توجہ کی بلکہ بہت سے دینی مضامین
بھی تحریر کئے ہیں جو " بزمِ ادب" اور " عون الاطفال" میں جگہ پا چکے ہیں۔

" مشیر نسوان" میں مولوی حافظ محمد مظہر نے امتہ العزیز سے متعلق یہ بیان دیا ہے کہ

موصوفہ اپنے اعلیٰ علم و فضل کی وجہ سے " مسلماتِ ہند" میں خاص مقام و مرتبہ کی حامل تھیں۔

آپ کو " تحفظ حالات عشیرہ" سے بے حد دلچسپی تھی۔ "تاریخِ احمدی" کے شجروں کی تکمیل کا سہرا بھی موصوفہ کے سر جاتا ہے۔

آپ کا ایک اور کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے افرادِ خاندان کی " تواریخِ اموات" کو حروفِ تہجی کے مطابق ترتیب دیا تھا جو آج بھی اس خاندان میں محفوظ ہیں۔ آپ کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف مولوی نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے اپنی کتابوں میں بڑے اچھے انداز میں کیا ہے۔

آپ نے اپنی آخری عمر میں خود اپنے اردو مخطوطات سے بھری الماری حیدر آباد کے ایک کتب خانے کو تحفتاً دے دی تھی۔

آپ حیدر آباد میں ۲۵ صفر ۱۳۶۶ھ میں جاں بحق ہوئیں۔ ☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : یادگار نمبر بتقریب جشنِ صد سالہ مدرسہء محمدی ص ۲۸ مطبوعہ ۱۴۰۹ ھ
(۲) : یادگار نمبر بتقریب جشنِ صد سالہ مدرسہء محمدی ص ۸۶ مطبوعہ ۱۴۰۹ ھ

حبیب النساء

آپ ٹمل ناڈو کے عظیم المرتبت شاعر نواب عبدالرحمٰن شاطر مدراسی کی بیگم اور نواب اشمہ آرکاٹی کی پوتی تھیں۔ موصوفہ نوابینِ آرکاٹ کے علم دوست اور اقربا پرور خاندان میں ۱۸۸۹ء بمقام مدراس پیدا ہوئیں۔ آپ کا سارا گھرانہ علم و فضل کے نور سے مزین تھا۔ گویا فارسی، عربی اور تینوں زبانیں ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ آپ بچپن سے شعر گوئی کی طرف راغب تھیں۔ بالخصوص طویل نظمیں کہنے میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ شاطر کے خاندان کی خواتین کی بہترین شعری صلاحیتوں کا اعتراف مولانا سید سلیمان ندوی نے ماہنامہ ''معارف'' (مطبوعہ نومبر ۱۹۲۵ء) میں کیا ہے۔

مولانا موصوف نے اس خاندان کے خواتین کے متعلق لکھا ہے۔

''مدراس میں جو سب سے عجیب چیز دیکھی وہ ایک شاعری کا گھرانہ تھا۔ شاطر صاحب کے والدِ مرحوم فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ شاطر صاحب خود اردو اور فارسی کے برجستہ گو شاعر ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ اور ان کی دو صاحبزادیاں بھی فارسی کی شاعرہ ہیں۔ شاطر صاحب نے فرمائش کی کہ میں اُن خواتین کو مصرعہ طرح دوں۔ چنانچہ اپنی واپسی کی مناسبت سے حافظ شیراز کا یہ مصرعہ زبان پر آیا۔

بہ شہر خود روم و شہریار خود باشم

دو تین گھنٹے کے بعد ان کی اہلیہ نے اس پر تین شعر، اور ان کی چھوٹی صاحبزادی نے پانچ شعر کہہ کر بھیجے، میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ بڑی صاحبزادی نے ایک اور طرح امتحان دینا منظور کیا کہ نثر میں کوئی واقعہ ان کے حوالہ کروں۔ ؛وہ اس کو نظم کردیں گی۔ میں نے سیرۃ النبیؐ حصہ دوم سے حضرت جابرؓ اور اُن کے یہودی قرضخواہ کا واقعہ نکال کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُنہوں نے اس واقعہ کو شاہنامہ کی بحر اور زبان میں مثنوی کے

دس پندرہ شعر میں نظم کر کے بھیج دیئے۔ نثر میں پہلا فقرہ یہ تھا۔ " حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں" اُنھوں نے نظم میں ادا کیا۔

روایت کند جابرِ نامدار

آج ہندوستان میں عورتوں کی نفس فارسی تعلیم کمیاب ہے۔ پھر فارسی میں شعر کہنا اوراِس طرح فی البدیہہ شعر کہنا کادرجہ حیرت انگیز ہے۔ اور یہ سب پرانی طرزِ تعلیم کے ساتھ انجام پایا ہے۔

بارك الله فی بیت العلم هٰذا "

موصوفہ کی ایک طویل نظم کے چند اشعار بطورِ نمونہ پیش ہیں۔

کرو تو چشم کو وا، آج یا اولو الابصار ... سُنو کہ آتی ہے چمنستاں میں نرگس بیمار
ہوئے ہیں ناز سے غنچے بھی محوِ آرائش ... لبھائے لیتی ہے دل شاخ تاروں کی بہار
ہے اک طرف گل نرگس تو اک طرف سوسن ... ہے ایک سمت کو لالے کی لال لال قطار
لگے گلاب کے ہیں پھول ایسے گلشن میں ... گلِ حدیقہ جنت ہیں جن پہ جن سے نثار
کھڑا ہے ناز سے سرو چمن بصد انداز ... وہ مدعی ہوں کہ مجھ کو ملی ہے قامتِ یار
خزاں کے پاؤں سے سبزہ ہوا تھا جو پامال ... یہ کہہ کے اٹھا ہے زندہ رہے بہار (۱)

....

بنا ہے گلشن بے خار آج ریگستاں ... وہ دیکھو آئی زمینِ عرب پہ آئی بہار
ہر ایک ذرہ یہاں کا ہے نازش خورشید ... ہر ایک قطرہ ہے مانند دیدۂ بیدار
کسی کے سجدے کو اصنام سر کے بل ہیں گرے ... صنم پرستوں کے چہروں پہ جم گیا ہے غبار
ہر ایک گوشہ عرب کا ہے آج خلدِ نمو ... ہر ایک ذرہ وہاں کا ہے اک تجلی زار (۲)

حوالہ جات

(۱)، (۲) : ماہنامہ " معارف "مطبوعہ نومبر ۱۹۲۵ء۔

حجاب امتیاز

حجاب امتیاز کی ولادت بڑی پیٹ، وانم باڑی، (ضلع شمالی آرکاٹ) ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی محمد اسماعیل مرحوم کی شخصیت ان دنوں بہت مصروف اورباوقار تھی۔ حجاب کی والدہ کا نام عباسی بیگم (التوفی ۱۹۲۸ء) تھا۔ ان کی والدہ ہی کے باعث حجاب میں بہت ساری خوبیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ عباسی بیگم تعلیم نسواں کی پُر زور حامی تھیں۔ ان کے ہاں دینی تعلیم کے رواج کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم کی اہمیت بھی بہت زیادہ تھی۔ انہوں نے حجاب کو بھی حسبِ منشاء بہترین تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا تھا۔ حجاب کے والدین دونوں بہت وسیع النظر تھے۔ وانم باڑی جیسے ماحول میں سخت پردے کی پابندیوں کے درمیان حجاب کو مشن اسکولوں میں تعلیم دلانا گویا اُس دور کے ماحول کے ساتھ ایک طرح کی بغاوت ہی تھی۔ جسے آنے والے ادوار کی پیش بینی بھی کہا جاسکتا ہے

جس وقت علامہ سید علی بلگرامی حیدر آباد میں معتمد تعمیرات تھے۔ اُن دنوں مولوی محمد اسماعیل صاحب کی بود وباش کچھ عرصے کے لئے وانم باڑی سے حیدر آباد تبدیل ہوگئی تھی۔ سید بلگرامی صاحب نے مولوی محمد اسماعیل کو اپنا پرسنل سکرٹری منتخب کیا تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ حجاب کے والد کوئی معمولی شخصیت کے مالک نہیں تھے۔ بعض احباب کا خیال ہے کہ مولوی محمد اسماعیل صاحب کے حیدر آباد کے قیام کے دوران ہی حجاب کی پیدائش حیدر آباد میں ہوئی ہے۔ مگر یہاں یہ بات مشہور ہے کہ حجاب وانم باڑی ہی میں غالباً ۱۹۰۸ء پیدا ہوئیں اور راقم کا بھی یہی اندازہ ہے۔

اُردو زبان وادب کا ذائقہ غالباً حجاب نے اپنی والدہ سے ہی چکھا ہے۔ کیونکہ ان کی والدہ عباسی بیگم اردو ماحول ہی کی پروردہ ہیں۔ اور تعلیم نسواں میں انہوں نے اردو ہی کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا تھا۔ وہ کس طرح حجاب کو اردو سے محروم رکھتیں۔ یہ بات بھی طے ہے کہ آج سے

تیس پینتیس سال پہلے تک بھی مشن اسکولوں میں اردو تعلیم کا بندوبست ہوا کرتا تھا۔ جس کی مثال مدراس کرسچن کالج ہائی اسکول ہے جہاں آزادی کے بعد بھی اردو حیثیتِ زبان سکھائی جاتی تھی۔ اُن دنوں وہ تعصب نہیں تھا سں جو آج کل اردو کے معاملے میں برتا جارہا ہے۔ حجاب کا بھی مشن اسکول ہی میں اردو کی تعلیم کا بہترین بندوبست ہوا ہوگا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ایک اطلاع یہ دی ہے کہ حجاب امتیاز میں بچپن ہی میں اردو مضمون نویسی کا شوق اُن کی والدہ عباسی بیگم کی بدولت پیدا ہوا تھا۔(۱) مشن اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے حجاب نے پوری طرح انگریزی معاشرت سے واقفیت حاصل کی تھی۔ ان کو ہوائی جہاز چلانے کا بھی بہت شوق تھا اور اس میں خاصی مہارت بھی حاصل کرلی تھی۔ حجاب ہندوستان کی پہلی مسلم خاتون ہیں جنہوں نے اس طرح کا امتیاز حاصل کیا ہے۔(۲)

حیدرآباد کی مشہور و معروف ادیبہ محترمہ جہاں بانو نقوی عرف بانو آپا (جو زنانہ کالج، عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو لکچرر تھیں) کے حجاب سے گہرے دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ بانو آپا نے ایک نجی خط میں حجاب کی جہاز رانی کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے۔

" وہ نازک کلائیاں جن میں دو دو چوڑیاں بھی بار ہوتی ہیں، ان کلائیوں نے ہوائی جہاز کی اسٹیرنگ کس طرح سنبھالی ہوگی"۔(۳)

یہی بانو آپا ہیں جو ماہنامہ " شہابِ ناہید" میں بے شمار مضامین قلم بند کرچکی ہیں اور جنہوں نے اپنی ایک کتاب " بربطِ ناہید " بھی ادبی دنیا کو تحفتاً دی ہے۔ اس کتاب میں کئی ایسے خطوط پیش کیے ہیں جن کی مخاطب حجاب ہی ہوسکتی ہیں۔ اس طرح کی گہری دوستی کے دور میں حجاب سے متعلق وہ کسی طرح کی غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتی تھیں۔

اردو کے مشہور و مقبول افسانہ نگار، کالم نگار، طنز و مزاح کے شہنشاہ جناب شوکت تھانوی جیسی عظیم شخصیت " نقوش" لاہور کے شخصیات نمبر (مطبوعہ ۱۹۵۵ء) میں حجاب امتیاز علی سے متعلق بہت ہی دلچسپ اور دل آویز ڈھائی صفحات پر مشتمل مضمون لکھا ہے۔ گو کہ مضمون پورے کا پورا حجاب امتیاز علی اور امتیاز علی کے گہرے اور بے تکلف تعلقات کا بہت اچھا خاکہ ملتا ہے اور کہیں کہیں موصوفہ کی شخصیت اور فن کے باہمی تعلق اور اثر کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ شخصی تعارف کے طور پر شوکت تھانوی یوں لکھتے ہیں۔

" جاننے کو تو میں اُن کو اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ حجاب امتیاز ابھی نہ تھیں

بلکہ مس حجاب اسماعیل تھیں اور ان کے افسانے "تہذیبِ نسواں" میں چھپا کرتے تھے۔ مگر اُن کو دیکھا سب سے پہلے ۱۹۴۰ء میں جب میں پنچولی صاحب کی طلبی پر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ، کی ملازمت ترک کر کے پنچولی آرٹ پکچرس میں لاہور آگیا تھا۔ اُس زمانے میں سید امتیاز علی تاج بہاولپور روڈ کی ایک کوٹھی میں رہا کرتے تھے اور میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں محترمہ حجاب امتیاز علی کا میں بس اتنا ہی مطالعہ کر سکا کہ وہ گویا کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں، کچھ بے نیاز سی اور الگ تھلگ سی"............

............" جس حجاب امتیاز علی کو میں بے نیاز اور الگ تھلگ سمجھ رہا تھا، اُن کی تو دنیا ہی دوسری ہے اور یہ دنیا انہوں نے خود اپنے لئے وضع کی ہے یہ وہی دنیا ہے جو اُن کے افسانوں میں نظر آتی ہے اور جس کی وہ بار بار اپنے پڑھنے والوں کو سیر کرا چکی ہیں، مگر سیر کرنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ شاید تحریری دنیا ہے، یہ شاید کوئی افسانوی فضا ہے یا کوئی شاعرانہ تخیل ہے میں خود بھی سمجھتا تھا، مگر جتنا جتنا حجاب امتیاز علی کو قریب سے دیکھا میں قائل ہوتا گیا کہ وہ جو کچھ لکھتی ہیں وہی اُن کے احساسات بھی ہیں بلکہ اُن کی سمجھ میں تو یہ بات آہی نہیں سکتی کہ ایک کیفیت کو محسوس کئے ہوئے کوئی اُس کیفیت کا اظہار کس طرح کر سکتا ہے۔ وہ جو مناظر اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں اُن مناظر میں وہ خود بھی کھوئی رہتی ہیں..............."۔

شوکت تھانوی بے ساختہ فقروں میں حجاب امتیاز علی کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ ایک فقرہ وہ اپنے مضمون میں نمونتاً بھی پیش کرتے ہیں۔

"گرم ایشیائی مئی کے سبز آسمانوں پر ہلکے کاسنی رنگ کا چاند متبسم تھا"۔

چونکہ شوکت تھانوی حد درجہ ظریف الطبع تھے وہ ایک خاص بات اپنے واسطے سے بھی لکھ جاتے ہیں جو بہت دلچسپ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

" حجاب امتیاز علی تجزیہ ءِ نفس کی دلدادہ ہیں۔ اس فن کا گہرا مطالعہ بھی کر چکی ہیں اور خود بھی اس فن کے لئے اپنے کو مطالعہ بنا کر پیش کر چکی ہیں۔ جب کبھی خود ان کو کوئی شکایت ہوتی ہے ماہرینِ معالجہ ءِ نفس کی خدمات

حاصل کی جاتی ہیں۔ مگر پچھلے سال جب وہ بیمار ہو کر صاحب فراش ہوئیں
تواُن کی نظر انتخاب ایک اور مسیحائے دوران، افلاطونِ زماں پر پڑی،
اور وہ تھا خاکسار۔ چنانچہ طے کیا گیا کہ میں روزانہ کچھ وقت ان کی خدمت
میں حاضر ہو کر بیماری کا غم غلط کرنے کی کوشش کیا کروں۔ چنانچہ میں نے
یہ خدمت بہ سرو چشم قبول کرلی اور روز اُن کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر
گپ ہانکا کرتا۔ لطائف بیان ہوتے۔ تاج صاحب، یاسمین (حجاب امتیاز علی کی
چہیتی لڑکی)، حجاب صاحبہ اور میں، یہ چار ایک کمرے میں بیٹھ جاتے اور
تھوڑی ہی دیر میں وہ کمرہ قہقہوں سے گونجنے لگتا۔ میرا کام صرف یہ تھا کہ
میں اُن کی بیماری کا مذاق اڑاتا رہوں۔ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہونے لگیں۔
جو بستر سے نہ اٹھ سکتی تھیں وہ سیڑھیاں اترنے لگیں۔ ڈرائیو پر جانے لگیں
اور صحت اتنی اچھی ہوگئی کہ نظرِ بد سے بچنے کی دعائیں دی جانے لگیں.........''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شوکت تھانوی جیسی شخصیت حجاب امتیاز کے لئے نہ صرف ایک ادبی شخصیت تھی، بلکہ ان سے گہرے مراسم والی ہمدرد اور مقبول شخصیت تھی۔ یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ یہ کوئی معمولی خاتون نہیں، بلکہ ایک عالم گیر فن کار کو بھی موہ لینے والی ادبی خاتون تھیں۔

حجاب امتیاز علی کے تعلقات معمولی ادبی شخصیتوں سے نہیں بلکہ آفاق گیر شہرت رکھنے والے اکابرین سے تھے جیسے نذر سجاد حیدر، قرۃالعین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ۔

راقم الحروف جب حجاب امتیاز کے تعلق سے معلومات کی فراہمی میں منہمک ہوا تھا تو ایسی بہت ساری باتیں لوگوں کی زبانی سنیں جس کا کسی تحریر میں اشارہ نہیں ہے۔ اس لئے سنی سنائی باتوں پر اعتماد کی ہمت بھی راقم میں پیدا نہیں ہوئی۔ البتہ انہیں معلومات کو قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے جن پر کسی کی تحریر کا حوالہ موجود ہو۔ ان کہی سنی باتوں میں ایک بات یہ بھی ہے کہ حجاب امتیاز اور بانو آپا کے درمیان کسی باعث تعلقات ترش و تند ہوئے تھے اور بانو آپا نے حجاب سے تنافر برتتے ہوئے مخالفت میں بہت کچھ لکھا تھا جن کا حجاب نے بڑی متانت سنجیدگی اور خوش سلیقگی سے جواب دیا جو ان کے ایک ناول میں موہوم صورت میں پیش ہوا۔ وہ جس کردار کے ذریعے جواب دے رہی ہیں۔ اِس میں بانو آپا ہی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

حجاب امتیاز علی ''نغمۂ موت'' میں جس کردار کو اجاگر کرتی ہیں کیا اُس میں بانو آپا کی

جھلک نہیں ملتی.........؟

"میں جانتی ہوں کہ تم کو سمندر کے نیل گوں پانیوں اور سفید موجوں سے عشق شدید تھا! خوبصورت دھوپ اور نرم چاندنیوں سے تمہیں روحانی سرور حاصل ہوتا تھا! شاعر کے گیت اور فاختاؤں، بلبلوں کے عشق کی صدائیں تمہیں بے خود بنادیتی تھیں۔ غروب و طلوع کے نظائر، تمہیں دیوانہ بنادیتے تھے۔ آہ! تم میرے لئے بجائے اک ماں کی مقدس اور بزرگانہ ہستی کے بچپن کی رفیق اور نوعمر بے تکلف ساعت کی کھیلی ہوئی سہیلی تھیں!! اور ہر موضوع پر آزادانہ دلربایانہ انداز میں بحث و گفتگو کیا کرتی تھیں........"

حجاب کی ناول نویسی کا انداز اور اس کا ڈھنگ اردو ادب کی ناول نگاری کی تاریخ میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ حجاب اپنے ناولوں میں بھی افسانوی فضا تخلیق کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے ناولوں کے کرداروں کے نام عجیب ڈھنگ کے ہوتے تھے۔ حجاب امتیاز روزنامچے لکھنے میں بھی دلچسپی رکھتی تھیں۔ ان کے کئی روزنامچے ہفت روزہ "تہذیبِ نسواں" (جس کے مدیران ممتاز علی اور ان کی رفیقِ حیات محمودی بیگم تھے) میں شائع ہوئے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ حجاب اسماعیل کی تحریروں کو پڑھ کر ممتاز علی کے فرزندِ ارجمند جناب امتیاز علی تاج (مشہور ڈرامہ نگار "انار کلی") حجاب کی جانب مائل ہونے لگے تھے۔ "تذکرہ جمیل" (مؤلف عبدالرزاق بسمل حیدر آبادی) نے بھی اپنی کتاب میں حجاب کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا ہے۔ جو باتیں سینہ بہ سینہ ہوتی ہوئی راقم تک پہنچی ہیں ان میں ایک بات یہ بھی ہے کہ عبدالرزاق بسمل اور حجاب کے درمیان مکتوب و مراسلت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا اور یہی سلسلہ اُن کے مابین "عشق و محبت" کا ذریعہ بنا۔ ممکن تھا کہ بسمل اور حجاب ایک دوسرے کے رفیقِ حیات بن جاتے مگر بسمل کی نانی صاحبہ کی مداخلت کی وجہ سے اس طرح نہ ہو پایا کیونکہ وہ حجاب کو کسی طرح بسمل کے قابل نہیں سمجھتی تھیں۔ آگے چل کر امتیاز علی تاج کی دلی خواہش ہی کارگر ہوئی اور وہ حجاب کو اپنانے میں کامیاب ہو گئے۔ امتیاز کی رفیقۂ حیات بننے کے بعد حجاب اسماعیل نے خود کو "حجاب امتیاز" کہلانا پسند کیا اور یہ نام ادبی دنیا کا بہت ہی معتبر، مصروف و مقبول نام بن کر ابھرا۔ حجاب امتیاز نے اپنے آخری ایام لاہور، (پاکستان) میں بتائے اور وہاں بھی وہ اپنے قلم کی مزید جولانیاں دکھاتی رہیں۔

حجاب امتیاز کے قلم سے تخلیق پانے والے ناموں میں سب سے پہلا ایک رومانی ناول ہے

جس کا نام " ظالم محبت " ہے۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی سے بیشتر ان کی تخلیقات "عالم گیر" اور "نیرنگِ خیال" لاہور میں شائع ہوتی رہیں۔ حجاب بچوں کے لئے بھی "پھول" دہلی میں کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں۔

اردو دنیا میں حجاب امتیاز کے جن افسانوں کو غیر معمولی شہرتیں نصیب ہوئیں ان میں "لاش"، "صنوبر کے سایے"، میری ناتمام محبت" اور "الیاس کی موت" "موت کا راگ" نہ صرف قابلِ ذکر ہیں بلکہ ان تمام ترافسانوں میں خود ان کے اپنے ماحول کی جیتی جاگتی تصویریں اور اپنی روزمرہ زندگی کے ہنستے کھیلتے، چلتے پھرتے روشن نقوش نمایاں ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱)،(۲) خواتینِ دکن کی اردو خدمات از مولوی نصیر الدین ہاشمی صفحہ نمبر ۲۷۵ (مطبوعہ ۱۹۴۰ء)
(۳) "بربطِ ناہید" از: جہاں بانو بیگم (مطبوعہ حیدر آباد) (۴) شخصیات نمبر "نقوش" لاہور صفحہ نمبر ۶۵۸ (۱۹۵۵)

ہاجرہ بیگم

آپ قادر مرتضٰی حسین سالار الملک کی پوتی اور مولوی محمد حبیب اللہ کی دختر تھیں۔ آپ بمقام مدراس ۲۵ رجب ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم خود اپنے والدِ بزرگوار سے پائی۔ اس دور میں اسکول کی تعلیم کا رواج مطلق نہیں تھا۔ آپ کی شادی ڈاکٹر محمد غوثؒ(۱) حیدر آبادی سے ہوئی تو آپ اپنے شوہر کے ساتھ حیدر آباد منتقل ہو گئیں۔ ڈاکٹر محمد غوث عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں لائبریرین تھے۔ موصوف اس کتب خانے سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد مدراس آئے تو ہاجرہ بیگم بھی اُن کے ہمراہ مدراس آگئیں اور آخری سانسوں تک اپنے شوہر کے ساتھ علمی وادبی کاموں میں مصروف رہیں۔

خاندانی کتابوں کی فہرست میں آپ کے متعدد قلمی نسخوں کے نام درج ہیں۔ (۲)

۱۔ خلاصۃ الماکولات والمشروبات (فارسی سے اردو میں ترجمہ)

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ہزار نام حروفِ تہجی کے مطابق مرتب کئے ہیں۔

۳۔ رسول اللہ کی روزانہ صبح وشام کی دعائیں۔

مندرجہ بالا کتابیں اردو میں ہیں جو آج بھی طباعت کی منتظر ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ آپ کو فارسی، عربی اور اردو زبانوں پر مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ آپ کی تحریریں پُر مغز اور انداز دلکش اور اثر آفریں تھا۔ ''مشیر نسوان'' کے دورِ اول میں بھی آپ کے مضامین موجود ہیں۔ بالخصوص آپ کے طویل مضامین میں ''اسلامی ممالک کی سیاحت'' اور ''سفر نامہ ء کلکتہ'' بہت وقیع اور جاندار ہیں۔

آپ نے بمقام مدراس ۲۴ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۹ء میں وفات پائی اور قبرستانِ حضرت عبدالحق ساویؒ عرف دستگیر میں تدفین عمل میں آئی۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : کتب خانۂ مدرسۂ محمدی اور امانتی کتب خانے کو نہ صرف ایک نئی زندگی بخشی بلکہ ان دونوں کتب خانوں کے قدیم مخطوطات اور کتابوں کی فہرست سازی میں اپنی ساری زندگی نذر کردی۔ آج موصوف ہی کی وجہ سے یہ کتب خانہ باآبرو ہے۔ آپ فارسی، عربی اور اردو زبان کے بہترین (Scholar) تھے۔ آپ کی خدمات پر ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے لیکن افسوس ہے کہ آج اس تاریخ ساز شخصیت کو لوگ فراموش کرچکے ہیں۔

(۲) : یہ مندرجۂ بالا تینوں قلمی نسخے بدرسہ محمدی کے کتب خانے کا مخزونہ ہیں۔

امتہ الرب بیگم

آپ مولوی غلام محمد شرف الدولہ کی نواسی اور مولوی ناصر محمد کی دختر تھیں۔ آپ بمقام مدراس ۱۹ رجب ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۹۰۸ء پیدا ہوئیں۔ آپ کے شوہر عبدالحکیم مدراس کے مشہور وکیل تھے جو بہت کم عمری میں رحلت کر گئے۔ آپ سارے خاندان میں (Social Worker) کی حیثیت سے معروف تھیں۔ موصوفہ نے اپنی زندگی اوروں کی خدمت میں گذار دی تھی۔ آپ کا ہر قدم معاشرے کی اچھائیوں اور نیکیوں کی طرف تھا، گویا

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کے مصداق اپنی آخری سانس تک اپنی زندگی دوسروں کی ہمدردیوں میں نچھاور کر دیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے دور دراز مقامات کا بھی سفر اختیار کیا اور اس میں جو بھی حالات پیش آئے، ان حالات کا جائزہ اپنے خطوط میں بڑی گہری نظر سے لیا ہے۔ موصوف کے بیش بہا خطوط آج بھی موصوفہ کی یاد اور خدمات کو روشن کر دیتے ہیں۔ اگر ہم ان خطوط کو شائع کر دیں تو ان کی ایک دستاویزی حیثیت ہو جائے گی اور آپ کی شخصیت ہندوستانی خواتین میں ممتاز مقام حاصل کر لے گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس خاندان کا کون سا فرد اس کام کو اپنے ذمہ لے کر بخوبی انجام دے گا۔

آپ نے ۲۸ رمضان ۱۳۹۹ھ مطابق ۲۲ اگست ۱۹۷۹ء کو حیدر آباد میں رحلت پائی۔

☆☆☆

خدیجہ ضیا

خدیجہ ضیا، نواب الرحمٰن خان شاطر مدراسی کی دختر تھیں۔ آپ بمقام مدراس ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئیں۔ عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم اپنے ابا حضور سے اور اپنی خاندانی خواتین سے جو ماہرینِ علم وادب تھیں حاصل کی۔ بچپن ہی سے اردو شاعری کا شستہ ذوق آپ کے اندر موجود تھا۔ صرف اس چنگاری کو ہوا دینے والے ماحول کی ضرورت تھی۔ آپ مدراس کی جیّد شاعرہ اشمہ آرکاٹی کی پر پوتی تھیں۔ اس خاندان کو اردو شعر وادب کے بیش بہا خزانے ورثے میں ملے تھے۔ اشمہ نے اپنی مثنویات کی وجہ سے عالم گیر شہرت پائی تھی۔ سخاوت مرزا نے بھرپور تقابلی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ بلحاظ پلاٹ اشمہ کو دیا شنکر نسیم، میر حسن، سعادت یار خان رنگین اور غلام علی مہر کی مثنویوں پر تفوق حاصل ہے اور موصوف نے اشمہ کی زبان و بیان پر بے پناہ قدرت یا اعتراف کیا ہے۔ (۱)

ضیاؔ کو اردو سے زیادہ فارسی زبان وادب سے لگاؤ تھا۔ خود ان کے رشتہ داروں کے پاس ان کا زیادہ تر فارسی آمیز کلام موجود تھا۔ آج وہ بھی نایاب ہے۔ اردو شاعری میں صنفِ نظم کی طرف مائل تھیں۔ اکثر نظمیں بڑی روانی اور سلاست کے ساتھ کہی جاتی تھیں۔ نظم گوئی کا فن شاید انہیں ورثے میں ملا تھا۔ مگر اشمہ آرکاٹی کے تبحرِ علمی، فنی دسترس اور نکتہ شناسی کے افق تک ان کی رسائی ناممکن تھی۔ کچھ نظمیں موصوفہ نے اقبالؔ کی نظموں سے متاثر ہوکر بھی لکھی ہیں۔ اپنی شاعری کے شباب پر آنے کے دور میں اچانک ان کی شادی ہوئی اور ہمیشہ کے لئے پاکستان چلی گئیں۔ پتہ نہیں ان کے پاکستان جانے کے بعد ذوق شعری پر کیا گذری بعض رشتہ داروں نے اتنا ضرور کہا ہے کہ انہوں نے ایک نظم آل اِنڈیا ویمنس کانفرنس کے جلسہ ششم (۱۹۳۱ء) میں سنائی تھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آج کیوں ہند کو ہے خطہ ءمدراس پہ ناز کیوں یہ آراستہ ہے آج بصد زیب و طراز
کس کی آمد پہ ہے یہ جوش وطرب چار طرف شہر میں ہوتا ہے اس شان سے کس کا اعزاز
ہند کے طبقہ ءِ نسوان کی جو ہے کانفرنس اس کے اجلاس ششم کا یہ ہوا ہے آغاز
خدمتِ قوم کی ہر اک کے ہے سینے میں اُمنگ ہے قدم رہروی سعی میں گرم تگ و تاز
سب شگفتہ رخ وخنداں لب وبیدار دماغ سب کے سب اہلِ دل ودیدہ ور ودو نکتہ نواز
ناخنِ فکر سے سلجھائیں وطن کے عقدے رہے سر رشتہ ءاُمید وطن اُن سے دراز

اے ضیاؔ تابہ کجا نازش وفخر ودعویٰ
ہاں زباں اب ہوبانہگ دعا نغمہ طراز (۲)

....

اب کہاں ذوق طلب اور وہ بیصری شوق خضر جویا ہیں اُنہیں پھر کوئی موسیٰ نہ ملا
تجلیاں حُسنِ نظر سوز کی ہیں اَب بھی نہاں ہاں تجھے حوصلہ ءِ چشمِ تماشہ نہ ملا
زندگی اُس کی ہے برباد بگولے کی طرح جس کی آنکھوں کو ترا نقشِ کفِ پانہ ملا
غرقِ عصیاں کو ملا مژدہ ءِ حسنِ فرجام ترے اقدام کے صدقے مجھے کیا کیا نہ ملا (۳)

....

میرے ساقی ادھر آ، پھر بہارِ جاں فضا آئی گلستاں سے پھر آتی ہے نوائے نغمہ پیرائی
خوشی کا گاتے ہیں پھر گیت مرغانِ ہوا مل کر نشاط انگیز ہے پھر فصلِ گل کی جلوہ فرمائی
یہ کیسا نو بہار اب کے پیامِ زندگی لائی کہ اُبھرے خاک کی چُٹکی سے آثارِ مسیحائی (۴)

ضیاؔ نے موضوعاتی نظمیں بہت زیادہ تعداد میں لکھی ہیں جو آج نایاب ہیں۔ پروفیسر محبوب پاشا سے اتنا علم ضرور ہوا ہے کہ وہ پندرہ بیس سال پہلے ہی انتقال کر گئیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب از : علیم صبا نویدی صفحہ ۲۹۰ ـ ۲۸۹ مطبوعہ ۱۹۹۹ء
(۲) (۳)(۴) : خواتینِ دکن کی اُردو خدمات از : مولوی نصیر الدین ہاشمی صفحہ نمبر ۲۷۴ مطبوعہ ۱۹۴۰ـ

عادلہ بیگم

عادلہ بمقام مدراس ۲۰ صفر ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم دیوان صاحب باغ، مدراس کے دینی ماحول میں ہوئی۔ مدراس سے ایس ایس ایل سی پاس کرنے کے بعد حیدر آباد میں بیاہی گئیں۔ شادی کے بعد موصوفہ نے اپنے شوہر محمد غوث مکرم (جو ذمہ دار گزیٹیڈ آفیسر تھے) کے عملی کاموں میں نہ صرف ساتھ دیا بلکہ "اوامر و نواہی" کی ترتیب و تدوین میں بھرپور ساتھ دیا ہے۔ چونکہ ان کا بہت گہرا رشتہ مدراس سے ہے وہ ہمیشہ مدراس آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان کا ایک کتابچہ "الاعلام فی کلام الله الملك العلام" (عربی زبان) میں منظر عام پر آچکا ہے

دیوان صاحب باغ کے امانتی کتب خانے کے کتابوں کی ترتیب اور اس کے "کیاٹلاگ" (Catalogue) کی تیاری میں موصوفہ نے ڈاکٹر محمد غوث مرحوم کی بے حد مدد کی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو امانتی کتب خانہ تتلیوں کی طرح بکھرا پڑا رہتا۔

☆☆☆

امتہ الولی عرف ولیہ بیگم

امتہ الولی ولیہ بیگم بمقام حیدر آباد ۹ صفر ۱۳۳۸ھ مطابق ۳ نومبر ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد مرتضٰی حسین مدراسی تھے اور آپ کی والدہ امتہ الوہاب چھوٹی بیگم حیدر آباد سے تھیں۔ امتہ الولی حیدر آباد میں تولد ہوئیں اور چند سال وہاں رہنے کے بعد بچپن ہی میں مدراس آگئیں۔ ابتدائی تعلیم قدیم روایات کے مطابق گھر کی چار دیواری میں ہوئی۔ عربی، اردو اور فارسی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے ہر موضوع کی کتاب کو بہ غور پڑھ کر اس سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔ انگریزی زبان کو بھی پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

دکھ اس بات کا ہے کہ وقت اور حالات نے ان کی بہترین صلاحیتوں کو گوشہ ءگمنامی میں ڈھکیل دیا۔ بڑی مشکل سے ماہنامہ " عصمت " دہلی میں موصوفہ کا ایک مضمون چھپ چکا ہے۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد ان کی جو پذیرائی ہونی چاہئے تھی، نہیں ہوئی۔ خاندان کے قلمی رسالے " مشیر نسواں " میں پابندی سے مضامین لکھتی تھیں۔ " مشیر نسواں " کے دورِ اول میں تین سو بیالیس مضامین اور دورِ دوم میں پچیس مضامین جگہ پا چکے ہیں۔

ان مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع، معلومات پُر مغز اور خیالات میں اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی کے نقوش تابندہ ہیں۔ ان کے مضامین کافی طویل ہونے کے باوجود اپنے اندر بڑی کشش اور جاذبیت رکھتے تھے۔

" مشیر نسواں " کے دورِ دوم میں ان کے " تبصرے اور تجزیہ " جو " قلمی دنیا " کے حصے میں جگہ پاتے تھے۔ وہ بڑے معرکتہ الآراء ہوتے تھے۔ (۱)

" مشیر نسواں " کے دورِاول میں موصوفہ نے " مشیر نسواں " کی ادارت بھی کی

اور بڑے شاندار اور فکر کو جھنجھوڑنے والے شاندار ادارئے بھی تحریر کئے۔ آپ کا ایک مستقل مضمون '' طب کی دنیا '' دس قسطوں میں '' مشیرِ نسوان ''میں جگہ پا چکا ہے۔

آپ کے بعض مضامین کے عناوین حسبِ ذیل ہیں۔

ہماری مضمون نگاری، میری پسندیدہ کتابیں، کشکولِ جذبات، اردو زبان کے چند شاعر، اردو نظم نگاری، مجھے نفرت ہے، خواتین خاندان اور مضمون نگاری، گلہائے رنگارنگ، ہماری ایک تفریح، حبِ وطن، وعدہ خلافی، کلامِ اقبال، علم و ہنر کا مقصد، سیرت رحمۃ للعالمین، ماہِ محرم، نماز، عورت کے لئے موزوں لباس، بادہء گل رنگ، گلستانِ سعدی کے چند حکایات، دست کاری، غیبت، اتفاق، اقبال کے اشعار، وغیرہ۔

آپ نے حیدر آباد میں ۱۴۱۱ ھ مطابق 1991 ء انتقال فرمایا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

☆☆☆

حوالہ

(۱):- '' مشیر نسوان '' کے تمام تر رسالے ڈاکٹر ذاکرہ غوث کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

ذاکرہ غوث

ذاکرہ غوث کی پیدائش ۶ اپریل ۱۹۲۳ء کو حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام فضل اللہ احمد ہے۔ جنہوں نے حیدر آباد میں حیدری گشتی کتب خانے کی بنیاد ڈالی اور اس کے بذاتِ خود مہتمم رہے۔ یہ کتب خانہ آج بھی جارس وساری ہے۔ اس کتب خانے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ذاکرہ غوث کی والدہ محترمہ امتہ الماجد نے اپنا تمام زیور بطورِ عطیہ دے دیا۔ امتہ الماجد نے اردو میں "خاندانی روزنامچہ"، "خاندان کی سوانحی قاموس" مرتب کی تھی۔ ذاکرہ غوث کا خاندان جنوبی ہند کے مشہور خانوادہ قاضی بدر الدولہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان کے مشاہیر میں قاضی بدرالدولہ کے علاوہ قاضی عبید اللہ، مولوی محمود صاحب، مولوی محمد مرتضٰی (۱) (تحریک جامعہ عثمانیہ کے اہم کارکن)، مولانا باقر آگاہ، قادر مرتضےٰ حسین، مولوی نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محمد غوث، قاضی صلاح الدین محمد ایوب (سر قاضی مدراس)، ڈاکٹر حمید اللہ، عبید اللہ زبیر (شرف الملک اکاڈمی کے کارکن) وغیرہ ہیں۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں ہوئی۔ پرائمری اور ہائی اسکول کی تعلیم گوشہ محل گرلس اسکول، ناملی گرلس ہائی اسکول، مچھلی کمان گرلس اسکول، وغیرہ میں پائی۔ آپ کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ پھر آپ نے کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ جس میں آپ کے مضامین فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی تھے۔ پھر جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد ہی سے بی۔اے کیا جس میں اردو کے علاوہ معاشیات و عمرانیات آپ کے مضامین تھے۔ پھر آپ نے ناگپور یونیورسٹی سے یم۔اے (اردوادب) کیا۔ آپ نے مدراس یونیورسٹی سے ایم۔لٹ کیا جس میں آپ کے مقالہ کا عنوان Baqar Agah's contribution to Arabic, Persian and Urdu تھا۔ مقالہ انگریزی میں تحریر کیا۔ اس مقالے کیلئے تین سال مدراس یونیورسٹی سے ماہانہ ۲۵۰ روپے کا

اسکالرشپ منظور ہوا۔ اس مقالے کے نگران پروفیسر یوسف کوکن تھے۔ اس کے بعد آپ نے ۱۹۹۴ء میں "خانوادہ قاضی بدرالدولہ کی خواتین کی تعلیمی اور ادبی خدمات" کے موضوع پر مدراس یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کیا۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث بڑی رکھ رکھاؤ والی خاموش طبیعت خاتون ہیں۔ ان میں ذرا بھر بھی نمائش یا زعم ہمہ دانی نہیں۔ خاندانی شرافت آپ کے ہر عمل اور قول سے چھلک پڑتی ہے۔ آپ نے ملازمت کا آغاز گورنمنٹ مڈل اسکول کھمم، آندھرا پردیش میں ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۶ء میں قلیل مدت کے لئے اسکول اسسٹنٹ تھیں۔ پھر ۱۹۵۴ء تا ۱۹۶۴ء ایتھیراج کالج مدراس میں اردو لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۴ء کے بعد اس کالج سے شعبہ اردو برخواست کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی ان کی ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ (ایتھراج کالج کا وجود مسلم ایجوکیشنل اسوسی ایشن، سدرن انڈیا کی کوشش سے قائم ہوا تھا اور زبانی معاہدہ ہوا تھا کہ اس کالج میں تاریخِ اسلام اور اردو کو بحال رکھا جائے گا، مگر افسوس کہ یہ زبانی معاہدہ قائم نہ رہ سکا اور آج یہ کالج دیگر علوم و فنون کے لئے مختص کر دیا گیا ہے)۔ اس ملازمت سے معطل کر دئے جانے پر ڈاکٹر ذاکرہ غوث کو ایک قلیل رقم دی گئی اور خیرباد کہہ دیا گیا۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے آندھرا پردیش، کرناٹک، مہاراشٹرا اور ٹمل ناڈو کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ ان میں بعض مقامات کا سفر ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی سوانح حیات ترتیب دینے کی غرض سے تھا۔ اس کے علاوہ اپنے شوہر محمد غوث، انسپکٹر آبکاری کے ساتھ حیدرآباد کے مختلف مقامات کا دورہ بھی کیا ہے اور ملازمت کے سلسلہ میں اور دیگر ضروریات کی بناء پر انہوں نے کھمم، ورنگل، اور محبوب نگر میں بھی مختصر مدت کے لئے قیام کیا ہے۔ انہوں نے سعودی عرب اور جرمنی کا بھی سفر کیا ہے۔ ان تمام سفروں میں ان کے شریکِ حیات بھی ساتھ رہے۔ آپ کی شاگردوں میں بہت ساری آج اچھی اچھی نوکریوں پر فائز ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔
ڈاکٹر نجمہ غوث، فاطمہ محمد، شہناز فرحت اللہ، ڈاکٹر افضل النساء، ڈاکٹر اعجاز جمشید، رضیہ بائی وغیرہ

ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے بہت سارے ریسرچ اسکالروں کی ہر حیثیت سے مدد کی ہے اور بہت سوں کو انہوں نے نوٹس بھی لکھائے ہیں۔ خود انہوں نے اپنے ریسرچ کے لئے ہر طبقے کے لوگوں سے ربط پیدا کیا ہے جن میں پروفیسر یوسف کوکن، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر انصار اللہ، ڈاکٹر حسن الدین ولا، علیم صبا نویدی، ڈاکٹر راہی فدائی، ڈاکٹر سلویا واٹک، پروفیسر محبوب

پاشا محبوب وغیرہ ہم شامل ہیں۔

آپ کی تصنیفات و تالیف میں چند کتابوں کے نام حسبِ ذیل ہیں :

۱۔ حیاتِ حق کی جھلکیاں ۲۔ انشائے حق (حصہ دوم) ۳۔ باقر آگاہ شخصیت اور فن۔

"حیاتِ حق کی جھلکیاں" (مطبوعہ ۱۹۷۵) میں ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے ایک دیباچہ تحریر کیا ہے جس مین موصوفہ نے اپنے محسن ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے تعلق سے بہت سے حقائق پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹایا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم ہی کی وساطت سے ایتھراج کالج میں حیثیتِ اردو لکچرر اُن کا تقرر ہوا۔ محترمہ موصوفہ کئی اعتبار سے ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی شخصیت سے متاثر تھیں۔ ایک طرف وہ انہیں ایک عظیم محسنِ قوم قرار دیتی ہیں تو دوسری طرف اُن کی علمی بزرگی سے وہ مرعوب ہیں۔ شاید ایک عرصے سے اُن کے ذہن میں ایک بہت بڑا منصوبہ تیار ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر عبدالحق کے تعلق سے وہ ضرور کوئی عظیم علمی اور ادبی کارنامہ سرانجام دیں گی اور آنے والی نسلوں کو ڈاکٹر حق کی سوانح حیات سے متعارف کروائیں گی۔

ڈاکٹر حق سے متعلق مواد جمع کرنا ایک طرح سے مشکل نہیں تھا تو آسان بھی نہیں تھا۔ آسان اس لئے نہیں کہ بہت سی باتیں لوگوں کے نجی مراسم کے ذریعہ ہی یکجا کی جاسکتی تھیں۔ وہ نجی مراسم اُن لوگوں کے تھے جو اپنی زندگی کے آخری ادوار میں تھے۔ اُن کی پہلی نظرِ انتخاب پروفیسر سید عبدالوہاب بخاری صاحب کی طرف گئی جن کے تعلقات ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تقریباً تیس چالیس سال کے عرصے پر محیط تھے۔ اس کتاب میں پروفیسر سید عبدالوہاب بخاری (مرحوم) کا ایک مضمون ڈاکٹر حق تقریباً کتاب کے نصف حصے کو گھیر لیا تھا۔ شاید موصوفہ نے اسی مضمون کو کتاب کا اصلی جزو سمجھا ہو اور اس کتاب میں بقیہ جو صفحات انہوں نے تحریر کئے ہیں وہ ایک سوانحی خاکے کی شکل میں ہیں۔ اس کتاب کو انہوں نے اپنی تصنیف کے بدلے ترتیب کہنا بہتر سمجھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کتاب کے گردپوش پر انہوں نے خود کو "مرتبہ" کہا ہے "مصنفہ" نہیں۔

اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ذاکرہ غوث کسی نام کی پیاسی نہیں ہیں بلکہ انہیں کام سے مطلب ہے اسی سادگی کے باعث ان سے بہت سارے حقوق لوگوں نے چھین لئے ہیں اور اب تک یہی ہوتا آرہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے غیر مطبوعہ تحقیقی کاموں سے استفادہ کر کے بہت سے پروفیسروں نے اپنے نام سے بہت سی باتیں شائع کرالی ہیں۔ اگر ذاکرہ غوث بعد میں یہ چیزیں پیش کریں گی تو گویا سرقہ کرنے والوں کی احسان مند قرار پائیں گی۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث سے کم صلاحیت رکھنے والے بعض نام نہاد " ڈاکٹر " بھی ان کی سرپرستی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور معصوم ڈاکٹر ذاکرہ غوث کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ صرف اس وجہ سے کہ ہمیشہ سے وہ منکسر المزاج رہی ہیں۔(۲)

" انشائے حق " حصہ دوم (مطبوعہ ۱۹۹۲ء مرتبہ ڈاکٹر ذاکرہ غوث) ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے خطوط کا ایسا مجموعہ ہے جس میں سے بہت سے اہم ترین خطوط کو مرتبہ کی علم واطلاع کے بغیر تلف کردیا گیا۔ اس کا پتہ ڈاکٹر ذاکرہ غوث کو اس وقت چلا جب کتاب جلد بندی کے بعد اُن کے روبرو پیش ہوئی تھی۔ موصوفہ کو اس بات کا آج تک قلق ہے کہ ان کے بھیجے ہوئے سو خطوط میں سے پچھتر خطوط کا کیا ہوا جب کہ غیر ضروری صرف پچیس خطوط اشاعت پذیر ہوئے۔ یہ بددیانتی آج تک عوام سے پوشیدہ ہے۔ ان پچھتر خطوط میں سے کئی خطوط ڈاکٹر اقبال احمد کرنولی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں شامل کرلئے اور یقیناً ان خطوط تک رسائی اقبال احمد سے ناممکن تھی(۳)۔ بقیہ تقریباً پچاس خطوط بھی شاید آئندہ کے کسی محقق نے وقت کے انتظار میں رکھ لئے ہوں۔ ڈاکٹر عبدالحق کی دختر ہاجرہ بیگم صاحبہ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ " انشائے حق " جلدِ دوم اب تک ایک نامکمل کتاب ہے۔ وہ اُسے مکمل دیکھنے کی متمنی ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر ذاکرہ غوث ہی کی وساطت سے...... اب دیکھیں مستقبل میں ڈاکٹر ذاکرہ غوث اس ضمن میں کیا اقدام کرتی ہیں!!

" مولانا باقر آگاہ ویلوری...... شخصیت وفن " کے موضوع پر اپنے اپنے طور پر کام کرنے والوں میں اجمالاً مولوی نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر قادی محی الدین زور، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر سیدہ جعفر اور پروفیسر محبوب پاشا کے اسمائے گرامی اور تفصیلاً جائزہ لینے والوں میں مولانا یوسف کوکن، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر افضل الدین اقبال، ڈاکٹر راہی فدائی اور علیم صبا نویدی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ راقم الحروف نے مولانائے موصوف کے سات مقدموں کو " مولانا باقر آگاہ ویلوری کے ادبی نوادر " میں پیش کرکے یہ ثابت کیا کہ مولانا آگاہ نے مولانی حالی، اور مولانا شبلی سے بہت پہلے اردو تنقید کی پہلی اینٹ " اقلیم اردو ادب " میں رکھی تھی اور ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کیا ہے کہ مولانا آگاہ کی تنقیدیں " مغربی ادب " کی مرہونِ منت نہیں تھیں۔(۴)

مولانا یوسف کوکن عمری نے " مولانا باقر آگاہ " نامی پہلی کتاب میں تحقیقی جائزہ اور عربی اینڈ پرشین لٹریچر ان کرناٹک " (انگریزی زبان) میں ضمناً تذکرہ پیش کیا ہے۔(۵)

ڈاکٹر محمد علی آثر نے مولانا آگاہ کی مثنویوں کا جائزہ لیا ہے۔ (۶)

ڈاکٹر راہی فدائی نے مولانا آگاہ ویلوری کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ (۷)

اس فہرست میں ڈاکٹر ذاکرہ غوث کا نام لینا ضروری ہے کہ ان کی تصنیف ''مولانا باقر آگاہ ویلوری ...... شخصیت اور فن'' شہر مدراس کی خواتین کی تحقیق و تفتیش میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ موصوفہ نے یہ مقالہ یم۔لٹ کے لئے تحریر کیا تھا اور بہت دیر کے بعد اس کی اشاعت عمل میں آئی اور وہ بھی اس وقت جب کہ اشاعتی سہولیات مدراس میں مفقود ہوتی جارہی تھیں۔ کتاب کو دیکھ کر قارئین کو اس کا پتہ چل سکتا ہے۔

راقم الحروف کو اس وقت اس کی طرف متوجہ کیا گیا جب کہ اس کتاب کا بہت سارا مواد کتابت کے مراحل سے گذر چکا تھا۔ مصروفیات کے باعث اس میں اغلاط کی تصحیح نہ ہوپائی اور خواہ مخواہ صفحات کا اضافہ ہو گیا۔ ڈاکٹر ذاکرہ غوث بھی اپنی عدیم الفرصتی اور صحت کی ناسازی کے باعث اس ضمن میں کچھ نہ کر سکیں۔ اُن کی ساری محنت ان صفحات میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایک جملہ پوری تحقیق اور دیانت داری کے ساتھ رقم پذیر ہوا ہے۔ خواہ وہ باقر آگاہ کی سوانح ہو یا اُن کی تعلیمی ہنگامہ آرائیاں۔ عوام سے روابط ہوں یا خواص سے نوک جھونک یا تنازعات۔ موصوفہ نے بتدریج موضوع کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کتاب کی تحقیق کے لئے انہوں نے تقریباً ایک سو دس تصانیف کے اوراق گردانی کی ہے اور رات دن ایک ہی دھن کے ساتھ لکھتی چلی گئی ہیں۔ عموماً یونیورسٹیوں میں تحقیقی مواد ہی کی طرف دھیان دیا جاتا ہے اور زبان وبیان کی شائستگی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہی حال اس کتاب کے سلسلے میں بھی ہوا ہے۔ تحقیق کی زبان بھی ادبی زبان ہی ہونی چاہئے۔ یہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں۔ دوسری زبانوں میں چاہے کوئی مذہبی کتاب ہو یا تاریخی کتاب، سائنسی کتاب ہو یا لسانیات کی کتاب، ہر جگہ پر زبان پر اہمیت دی جاتی ہے۔ مگر اردو والوں میں خصوصاً ٹمل ناڈو کے اردو پروفیسروں میں زبان کی کوئی اہمیت نہیں رہتی، اُن کو ان کے منصب اہم ہیں۔ ایسے پروفیسران کی میری وسالاری میں ڈاکٹر ذاکرہ غوث کا بیڑا بھی غرق ہو جاتا مگر اپنے بل بوتے پر موصوفہ سنبھل گئیں اور ایک حد تک زبان کی شائستگی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ آج تحقیق کے شعبہ ء کے طلباء کس ڈھنگ سے چل رہے ہیں اُس پر کہا جائے تو یقیناً ایک کہرام مچ جائے گا۔

راقم ہمیشہ راست گوئی سے کام لیتا رہے ہے اور آئندہ بھی لیتا رہا ہے۔ اُسے کس بات کی

فکر، نہ تو وہ کسی یونیورسٹی کا پروفیسر ہے نہ کسی بڑے ادارے کا منتخب شدہ عہدے دار...... نہ کسی غرض کے مرض کا شکار......

ڈاکٹر ذاکرہ غوث کی تصنیف میں تقریباً تیرہ باب شامل ہیں۔ تحقیقی مقالے کے اصولوں کے مطابق ابتدائی باب میں اُس علاقے کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے پس منظر میں مولانا باقر آگاہ کی شخصیت ابھری تھی۔ یعنی اٹھارویں صدی کے کرناٹک کے سیاسی حالات اور اہلِ نائط کا اقتدار اور تنزل۔ پھر وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے موصوفہ باقر آگاہ کے نسبی پس منظر میں اہلِ نائط کا تفصیلاً جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے میں انہوں نے بہت ساری کتابیں چھان ڈالی ہیں۔ جن ذرائع سے مذکورہ بالا مصنفین نے استفادہ کیا ہے۔ ان سے ہٹ کر بھی ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے چند اور اشخاص کی تحریروں پر تحقیقی نظر ڈالی ہے خصوصاً خود مولانا باقر آگاہ ویلوری کی تحریروں سے بالراست مواخذات اس میں ہمیں ملتی ہیں۔ انہوں نے آگاہ کی عربی اور فارسی تحریروں کو چھوڑ کر ان کی دکنی اور سلیس اردو تحریروں کو چھاننا بہتر سمجھا۔ چونکہ یہ مقالہ اردو ایم۔ لٹ کی سند کے لئے تھا۔ صرف اسی زبان کی تخلیقات اور نثری کاوشوں کو ٹٹولا ہے۔ ایک حیثیت سے یہ کتاب باقر آگاہ کا روزمرہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔

آگاہ کی دربارِ والا جاہی سے وابستگی اور اس سے غیر وابستگی دونوں کا تفصیلاً جائزہ لیا ہے۔ آگاہ کی شخصیت اور کردار واضح طور پر ابھرے ہیں۔ اس کتاب کو موصوفہ نے آنے والے محققین کے لئے بھی اس کتاب کو ایک حوالہ جاتی کتاب (Reference Book) کے طور پر پیش کیا ہے۔ موصوفہ کے بہت سارے خیالات سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے اور وہ محض عقائد کے اختلافات کے باعث ذاکرہ غوث صاحبہ نے اس خوف کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور جو کہنا ہے اپنے طور پر بیان کر گئی ہیں۔ یہ بے باک کوشش قابلِ تحسین ہے۔ اس کتاب میں موصوفہ نے ضرور ایسے گوشے بھی ابھارے ہیں جو محققین کی نظروں سے پوشیدہ رہے ہیں یا جن پر کھل کر کچھ نہیں کہا گیا۔ بعض ایسے گوشے محض اشاروں میں پیش کر دئے ہیں جن پر تفصیل سے لکھا جانا چاہئے تھا۔ مثلاً شیعہ اور سنی عقائد کے تنازعہ میں مولانا باقر آگاہ نے جو رویہ اختیار کیا تھا اُس کو مبہم ہی رہنے دیا گیا۔ شاید وہ اس سلسلے میں پرانے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتی تھیں۔ حضرت قربی ویلوری اور ذوقی ویلوری سے ان کے مراسم کی تفصیل بھی نہیں ملتی۔ اگر ان مراسم سے پردہ اٹھایا جائے تو کتاب کے صفحات میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ مقالہ سند کے لئے تھا تو اجمال ہی کافی تھا۔ مگر جب

کتابی شکل کی ضرورت پیش آئی تو ان کو شامل کر لینا چاہیے تھا۔ اس سے اس کتاب کی وقعت واہمیت یقیناً بڑھ جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ اس پر موصوفہ کی کوئی مجبوری ہو جس کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر پائی ہیں۔ اس مقالے میں موصوفہ نے حضرت آزاد بلگرامی اور حضرت باقر آگاہ کے درمیان تنازعات کا واضح جائزہ لیا ہے۔ حضرت آزاد کی پہل پر ہی آگاہ کو مجبوراً چہار صد اپراد پر کلامِ آزاد مرتب کرنے کی طرف مائل ہونا پڑا تھا۔ مصنفہ نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ان تنازعات کے باوجود بھی دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ حضرت آزاد عمر میں حضرت آگاہ سے ۴۲ سال بڑے تھے اور علم و تجربے میں بھی وہ آگاہ سے کئی گنا بڑھے ہوئے تھے۔ تاہم آگاہ کے معاملے میں آزاد بلگرامی نے اپنی بزرگی کا حوالہ نہیں دیا بلکہ اکثر نظر انداز کر دیئے یا کم گوئی ہی کو بہتر جانا۔

حضرت آگاہ کے تعلق سے ان کے ادوار کی بہت ساری علمی اور ادبی بزرگ ہستیوں کا بر سبیل تذکرہ جائزہ اس کتاب میں ملتا ہے۔ اکثر جگہ غلط کتابت کے باعث جملے سمجھ میں نہیں آتے ہیں۔ کاش وہ اس کی اصلاح کروا دیتیں اور کتاب کے آخر میں ضمیمہ کی حیثیت سے منسلک کرا دیتیں تو ان کی کتاب کو وہ اور بھی معتبر بنا دیتیں۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے اپنی زیرِ اشاعت تصنیف ''خواتین خانوادہء بدر الدولہ کی علمی خدمات'' میں بڑی فنی چابک دستی اور تعمق نظری سے اُس دور کے جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی اور سوانحی پس منظر میں اس خاندان کی خواتین کی علمی، ادبی، تہذیبی اور ملی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی علمی و ادبی لیاقت، فکری آفاقیت اور ان کے تمدنی ارتقاء کا مکمل جائزہ لیا۔ کہیں کہیں انہوں نے اپنی تحریروں میں اُس دور کے گوناگوں تقاضوں، پیچیدہ مسائل اور نت نئی صالح قدروں پر بھی اجمالی روشنی ڈالی ہے جس کی وجہ سے اُس دور کے تاریخی خدوخال بھی واضح طور پر سمجھ کی حدود میں آگئے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث کی پیشِ نظر تصنیف دس ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں قبل اسلام عربوں کے اہلِ ہند سے روابط، تجارتی تعلقات اور اسلام کے آغاز کے بعد تبلیغ مذہب کی خاطر شیوخ عرب کی ہندوستان میں آمد کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ خاندانِ بدر الدولہ انہی عرب شیوخ کی اولاد کہلاتا ہے۔

دوسرا باب آرکاٹ اور مدراس کے علمی، ادبی اور تہذیبی پس منظر کی حیثیت رکھتا ہے جس میں نوائط خاندان کی حکومت سے لے کر والاجاہی عہد کے خاتمے تک کے تاریخی اور سماجی حالات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں فقیہہ عطا احمد سے مولوی محمد غوث شرف الملک تک کے عہد کی خواتین کی مذہبی اور علمی خدمات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

چوتھے باب میں برطانوی حکومت کی الحاقی پالیسی کے زیرِ اثر کرناٹک کے نوابوں کے برائے نام اقتدار کے خاتمے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ خانوادہء قاضی بدرالدولہ کی مدراس سے حیدر آباد ہجرت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

چھٹے باب میں خواتین خانوادہء بدرالدولہ کی تصنیفی و تالیفی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے

ساتویں باب میں اس خاندان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ مستورات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

آٹھواں باب خاندانِ قاضی بدرالدولہ کی درس و تدریس سے وابستہ اور ملازم پیشہ خواتین سے متعلق ہے۔

نویں باب میں خانوادہء بدرالدولہ کی ایسی مستورات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جنہوں نے اپنے آپ کو سماجی اور اصلاحی خدمات کے لئے وقف کر دیا تھا۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث کے بیان میں صد فی صد سچائی ہے کہ خانوادہء قاضی بدرالدولہ کے خاندان کی مستورات پردہ نشین، دین دار اور مذہبی ہونے کے علاوہ تعلیم یافتہ وسیع النظر، کشادہ دل، روشن دماغ اور تمدنی اعتبار سے ترقی پسند رہی ہیں۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان خواتین نے اپنے زمانے میں تعلیمِ نسواں کو عام کرنے کی تحریک کو اپنی زندگی کا نہ صرف شعار اور مقصد بنایا، بلکہ اپنی تحریروں کے وسیلے سے خواتین خاندانِ نائطہ میں دینی و علمی بیداری کے جوہر پیدا کرنے اور ان کو اپنے ماحول میں سلیقے سے نمایاں کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان خواتین نے اس مشن کو قلمی رسالوں سے ایک نئی زندگی اور توانائی عطا کی۔ یہ رسالے یقیناً اُس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی لہروں کے وہ آبگینے ہیں جن میں اُس وقت کے علمی گھرانوں کی عورتوں اور بچوں کی نایاب اور نادر تصویریں روشن ہیں۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے اس مقالے کے توسط سے اُس دور کے حالات کو بے نقاب کیا ہے جس دور میں عوام میں تعلیم نسواں عنقا تھی اور خواص میں بھی مقبول نہ تھی۔ متمول، دینی اور علمی گھرانوں میں بھی تعلیم نسواں بالکل واجبی تھی۔ اُس وقت خانہ نشین عورتوں کا اردو پڑھنے کی حد تک تعلق تھا لیکن انہیں تحریروں کے فن کو برتنے سے باز رکھا گیا، کیونکہ یہ بات اس زمانے میں غیر مستحسن متصور تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر ذاکرہ غوث کا یہ مقالہ قاضی بدرالدولہ کے خواتین کی

تحریروں، روزناموں، مراسلات، طبّی نسخوں اور رسائل کا عکاس ضرور ہے۔ لیکن ایک بات اس مقالے سے ضرور کھٹکتی ہے وہ یہ کہ اس خاندان کے خواتین کی تحریروں کے نمونے شامل نہیں ہیں۔ کاش موصوفہ اس طرف بھی توجہ دیتیں تو یہ مقالہ اور بھی جان دار اور وقیع ہو جاتا۔

من حیثیت المجموع ذاکرہ غوث کی یہ کتاب سوانحی، تاریخی، علمی، ادبی اور تحقیقی اعتبار سے خواتین کی تاریخِ ادب اردو میں واقعی ایک قابلِ قدر اضافہ ہے اور ہمارے دیس کی خواتین کے لئے ایک ایسا روشن مینار ہے جس کی کرنوں میں ہر باصلاحیت خاتون اپنے کھوئے ہوئے مقام اور وجود کو تلاش کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جائے گی۔

ان کے علاوہ مختلف کتب اور رسائل میں آپ کے مضامین شامل ہیں۔ آپ کے مضامین میں چند عنوان یہ ہیں: ا۔ اردو کے حامیان نسواں اصحاب ۲۔ امتہ الغنی کا سفر نامہ (مرتبہ حسن جہاں) میں پیش لفظ ۳۔ ٹمل ناڈو جماعت نہم کی ٹکسٹ بک میں ڈاکٹر عبدالحق سے متعلق مضمون ۴۔ رسالہ قومی رپورٹ کے عبدالحق نمبر میں ڈاکٹر عبدالحق کے متعلق مضمون وغیرہ جن رسائل اور اخبارات میں مضامین طبع ہوئے ہیں، ان میں 'نوائے ادب' ممبئی، اخبار 'مسلمان' چینئی، اخبار 'سیاست' حیدرآباد، اخبار 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، 'ہماری زبان'، دہلی، 'خاتون' ممبئی، 'شاہین' کرنول، 'حریم' لکھنؤ، 'شہاب ناہید'، حیدرآباد، "خوشبو کا سفر" حیدرآباد وغیرہ ہیں۔

ان کے علاوہ بعض سالناموں مثلاً ضیاء، پریسڈنسی کالج، ایتھراج کالج میگزین وغیرہ میں بھی آپ نے اپنی تحریریں پیش کی ہیں۔ قلمی رسائل میں بھی آپ نے قلمی تعاون کیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے اردو کی خاموش خدمت کی ہے آپ کی تمام تحریریں شخصیات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس کے لئے تحقیق کا بھی کافی کام کیا ہے۔ آپ کی تحریر سادہ اور بغیر کسی زیب و زینت کے ہوتی ہے۔ آپ کو محض مواد پیش کرنے سے کام ہے۔

آج بھی آپ تحقیق و تدوین کے کاموں میں منہمک ہیں۔ آپ کے قلم سے اور بھی بہت کچھ تخلیق پانا ہے۔ خواتین نثر نگاروں میں آپ کا نام احترام سے لیا جائے گا۔ ☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : موصوف حیدر آباد سے ایک جریدہ " صحیفہ " شائع کیا کرتے تھے جس نے اس دور کی صحافتی معیار کی بلندیوں کو چھوا تھا

(۲) : اس کتاب کو ذاکرہ غوث کی منکسر المزاجی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے " انشائے حق " (حصہ دوم)ا

(۳) : " افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق کی تعلیمی اور اردو خدمات " از : ڈاکٹر اقبال احمد مطبوعہ ۱۹۹۵ ء

(۴) : مولانا باقر آگاہ ویلوری کے ادبی نوادر مع انتخاب کلام از : علیم صبا نویدی مطبوعہ ۱۹۹۴ ء

(۵) : باقر آگاہ از : مولانا یوسف کوکن مطبوعہ ۱۹ ء

(۶) : نوادرات تحقیق از : ڈاکٹر محمد علی اثر مطبوعہ ۱۹۹۶ ء

(۷) : دار العلوم لطیفیہ ویلور کا ادبی منظر نامہ از : ڈاکٹر راہی فدائی مطبوعہ ۱۹۹۷ ء

حسنیٰ بیگم

حسنیٰ بیگم بمقام مدراس ۱۹۲۵ء مطابق ۱۳۴۴ھ میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم مدراس کے دینی ماحول میں گھر کی چاردیواری میں ہوئی۔ نو سال کی عمر میں حیدر آباد گئیں اور وہیں ہائی اسکول اور بی۔اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ بی۔اے میں فارسی، عربی اور فلسفہ کے (Subjects) میں امتیازی درجے میں کامیابی حاصل کی۔ بی۔اے کرنے کے بعد خوش قسمتی سے وہیں ملازمت بھی مل گئی برسوں ملازمت (پنشن ڈپارٹمنٹ میں لیڈی کمشنر) کی قید میں رہ کر بھی علمی ذوق کو تروتازہ رکھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ علمی وادبی ذوق مدراس کے ماحول میں دوبارہ پروان چڑھا۔ "مشیر نسواں" (دورِ دوم) میں ان کے بہت سے مضامین جگہ پا چکے ہیں۔ اندازاً ایک سو سے زیادہ مضامین مختلف عناوین کے تحت لکھے ہیں موصوفہ نے ایک جگہ خود اعتراف کیا ہے کہ "مشیر نسواں" نے ہی انہیں مضمون نگاری کی طرف مائل کیا تھا۔ ان کے مضامین کی سب سے بڑی خصوصیت موضوع کا تنوع اور اظہار کا بے ساختہ پن ہے۔ انہی دو انفرادیتوں نے انہیں "مشیر نسواں" میں بہت اونچا اٹھایا۔ اکثر مضامین مختصر اور جامع ہیں۔ ان کی تحریروں کا اسلوب نہایت دلکش اور دل نشین رنگینیوں سے مملو ہوتا ہے۔ روزنامہ "سیاست" حیدر آباد میں ان کے جو مضامین شائع ہوئے ان کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ آئی بات سمجھ میں (مزاحیہ) ۲۔ گوشت ۳۔ ریزگاری کی قلت ۴۔ غلط العوام فصیح
۵۔ پہلی تاریخ ۶۔ اے زر تو خدا نہیں ۷۔ مہنگی کفایت شعاری ۸۔ حکایتِ مہر و وفا

"روحِ ترقی" حیدر آباد اور بچوں کا رسالہ مدراس (جو قلمی رسالے تھے) میں بھی ان کے طنزیہ مضامین خصوصی طور پر جگہ پا چکے ہیں۔ ان رسائل کے بعض نسخے راقم الحروف نے ڈاکٹر ذاکرہ غوث کے ہاں دیکھے ہیں۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے "سیر النبیؐ" (قاضی بدرالدولہ کی تصنیف فوائد بدریہ جو قدیم دکنی زبان ہے) کو بہت آسان زبان میں ڈھالنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ "سیر النبیؐ" کی دو جلدیں "صفی الدین ٹرسٹ" مدراس میں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ مزید دو جلدیں زیرِ اشاعت ہیں۔ موصوفہ سے اور بھی بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ ☆☆☆☆

ہاجرہ بیگم عرف ہاجرہ بی بی

ہاجرہ بی بی مولانا مولوی افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی بابائے اُردو جنوبی ہند کی دختر نیک اختر ہیں۔ آپ کی ولادت 1932ء میں مدراس میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایک عظیم باپ کی بیٹی کی تعلیم وتربیت کس اعلیٰ پیمانے پر ہوئی ہوگی۔ گورنمنٹ ہوبارٹ ہائی اسکول (مسلم گرلس ہائی اسکول) سے یس۔یس۔یل۔سی میں امتیازی درجہ میں کامیاب ہونے کے بعد انٹر میڈیٹ کی تعلیم مسلم گرلس کالج (جو بعد میں ایتھراج کالج کے نام سے موسوم ہوا) میں حاصل کی۔ اس کے بعد مدراس کے مشہور ومعروف کالج پریسیڈنسی کالج میں بی۔اے۔(آنرس) اور ایم۔اے (معاشیات) سے سرفرازی حاصل کی۔ حصولِ تعلیم کے بعد آپ مدراس کوئن میرس کالج (Queen Mary's) میں لکچرر مقرر ہوئیں۔ آپ کا تدریسی دور بہت ہی قلیل رہا۔ اچانک 1953ء میں بلاری کے حضرت عبدالحق صاحب، فرزندِ عبدالرؤف صاحب سے ازدواجی رشتے سے بندھ کر آپ نے مدراس کو خیرباد کہا اور بلاری میں سکونت اختیار کرلی۔

مدراس میں قیام کے دوران آپ نے اپنے ابا حضور سے بھرپور اکتسابِ نور کیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ اپنے باپ کی چہیتی بیٹی تھیں۔ راقم السطور نے ڈاکٹر عبدالحق کے سیکڑوں خطوط ہاجرہ بیگم کے نام دیکھے ہیں۔ (۱) موصوف نے علی گڑھ، دہلی اور ترچناپلی سے بہت اہم ترین مکتوبات اپنی بیٹی کے نام تحریر کیے ہیں جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

ہاجرہ بیگم کی بہترین اردو صلاحیتوں کا اندازہ ہمیں ان کی غیر مطبوعہ کتاب "باپ، بیٹی کی نظر میں" سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کا مسّودہ مولانا رشید احمد صدیقی کے ہاتھوں میں مقدمہ لکھنے کے لئے گیا تھا۔ مولانا نے اس کتاب پر نظر غائر ڈالتے ہوئے اِدھر اُدھر معمولی سی ترمیمات کے بعد ہاجرہ بیگم کو واپس بھیج دیا تھا لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ آج تک اس کتاب

کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

ڈاکٹر اقبال احمد (اردو لکچرر، اسلامیہ کالج، کرنول) کے تحقیقی مقالے کے مطالعہ سے اتنا ضرور احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے ہاجرہ بیگم کی اس غیر مطبوعہ کتاب سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔ (۲)

ڈاکٹر عبدالحق کے وصال کے بعد ہاجرہ بیگم نے اپنے باپ کی محبتوں اور موصوف کی بیش بہا اردو خدمات کے اعتراف میں "انشائے حق" حصۂ اول اور " انشائے حق (۳)" حصۂ دوم کے ساتھ ساتھ "حیاتِ حق کی جھلکیاں (۴)" پیش کیں۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے اپنے محسن ڈاکٹر عبدالحق کے بیکراں خلوص کے پیشِ نظر جو کتاب تخلیق کی تھی وہ خوش قسمتی سے عبدالحق کے انتقال کے بعد ہاجرہ بیگم کو پسند آگئی اور ہاجرہ نے اس کی اشاعت میں خاص توجہ دی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہاجرہ بیگم ہی کی مساعی سے عثمانیہ کالج کرنول کے سلور جوبلی کے جشن میں اس کتاب کی رسمِ اجراء بھی عمل میں آئی۔ بعض معتبر ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سری وینکٹیشورا یونیورسٹی کے نصاب میں اس کتاب کو شامل کیا گیا ہے۔ یہاں ان تمام باتوں کا اظہار غیر ضروری سہی لیکن ان کتابوں کے توسط سے ہاجرہ بیگم کی تحریری صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

" انشائے حق "کی جلد اوّل میں ہاجرہ بیگم صاحبہ کا مقدمہ جگہ پایا ہے جس میں موصوفہ نے نہ صرف" انشائے حق " کے مضامین کی زبان، اس کے اندازِ بیان اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، بلکہ مختصر الفاظ میں اپنے مرحوم پدر بزرگوار کی شخصیت سے حد درجہ محبت، عقیدت اور احترام کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ مقدمہ موصوفہ کی نثر کا ایک بہترین نمونہ ہے جس میں بات کو کھینچ تان کر بیان کرنے کی بے جا روایت سے گریز کرنے کی بہت اچھی کوشش ہے۔ یہ مقدمہ بہت ہی مختصر ہے مگر اپنی جگہ جامع اور مکمل ہے۔ (۵)

" حیاتِ حق کی جھلکیاں "کا پیش لفظ ہاجرہ بیگم صاحبہ کی ایک اور واضح طرزِ نگارش ہے۔ " حیاتِ حق کی جھلکیاں " ڈاکٹر ذاکرہ غوث کی عقیدت مندانہ کاوش ہے۔ اس کاوش کے پس پشت بڑی حد تک ہاجرہ بیگم صاحبہ کا تعاون پوشیدہ ہے جس کا ذکر خود مولفہ نے اپنے دیباچہ میں کیا ہے۔ پیش لفظ میں موصوفہ نے ایک بہت اہم بات کہی ہے جس کو پڑھ کر واقعی یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک زمانہ جو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے دبستانِ علم وادب سے خوشہ چیں رہا ہے وہ اُن کی وفات کے بعد مرحوم کو ایسا بھول گیا جیسے کبھی سر زمین مدراس پر اُن کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ اور ڈاکٹر ذاکرہ

غوث کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے ہاجرہ بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ بھولے ہوئے ماحول کو پھر سے یاد دلانے کی ذمہ داری کا حق قدرت نے ایسی نسوان عالمہ اور محقق کے سپرد کیا ہے جس پر ڈاکٹر عبد الحق مرحوم کے بڑے احسانات رہے ہیں۔ کم از کم ایک محسن ایسا پیدا ہوا جس نے ان تمام احسان سے دبے ہوئے لوگوں کو شرم و انفعال کے سمندر میں غرق کر دیا۔ ہاجرہ بیگم نے کتنے دکھ سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ یہ پیش لفظ یقیناً اس کتاب میں نہ صرف ایک اضافہ ء لاگزیز ہے بلکہ ایک خوابیدہ دور کو جھنجھوڑنے کے لئے ایک بہترین تازیانہ بھی ہے۔ مذکورہ پیش لفظ میں ہاجرہ بیگم صاحبہ نے اپنے قلم کی جولانیاں بھی دکھائی ہیں اور اس کی مولفہ کو جس حد تک خراج پیش کرنا تھا پیش کیا اور کسی مبالغہ آمیزی اور غلط بیانی کا ذرا بھی شائبہ نہیں ہونے دیا۔ اس طرح کی صاف بیانی ان کی نثر کو اور زیادہ معتبر اور مستند بناتی ہے۔

"مشیر نسوان" (اہلِ نائط کا قلمی رسالہ) میں بھی ہاجرہ کے دو مضامین بہ عنوان "حج اور اسلامی ممالک کا سفر نامہ" اور دوسرا "امریکہ کا سفر نامہ" شامل ہیں۔ آپ کا ایک اور تفصیلی مضمون ڈاکٹر ذاکر حسین کے متعلق ہے جو مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ ڈاکٹر عبد الحق کے اچانک انتقال کے سانحے سے متعلق آپ نے اپنے جو تاثرات قلمبند کئے ہیں وہ اے جے اُردو سمینار کے سالنامہ "فانوسِ خیال" میں جگہ پا چکے ہیں (۶) جو "البلاغ" (ماہنامہ 1957) میں بھی موصوفہ کا مضمون "جہاز کا سفر، مکہ میں قیام اور حج" سے متعلق شائع ہوا ہے۔ (۷)

راقم الحروف کو ہاجرہ بیگم کے بعض مکتوبات "مشیر نسوان" میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ (۸)

سنا ہے کہ 1965ء سے 1995ء تک ڈاکٹر ذاکرہ غوث کے ساتھ ہاجرہ بیگم کے بڑے گہرے مراسم رہے۔ اس طویل مدت میں ان دونوں کے دوستانے میں جو تقدس پیدا ہو گیا تھا وہ انمول اور ان مٹ تھا۔ موصوف کے بہترین خطوط کا انبار راقم نے ڈاکٹر ذاکرہ غوث کے ہاں دیکھا ہے۔ ان خطوط کے آئینہ میں ہاجرہ بیگم صاحبہ کی شخصیت اور ان کی علمی اور ادبی برتری کھل کر سامنے آتی ہے۔ زبان و بیان میں بلا کی کشش اور جاذبیت کی نور افشاں کیفیت، اظہار میں صداقتوں کی دل آویز پھلجھڑیاں، احساس و جذبات میں پاکیزگی کی خوشبودار لہریں اور نہ جانے کیا کیا دل کو موہ لینے والے سامان ان کی تحریروں نے مہیا کئے ہیں۔

ان دونوں کی اس دوستی سے اردو ادب کا یقیناً اچھا خاصا فائدہ ہوا۔ ڈاکٹر ذاکرہ غوث

نے ان سے کئی ایک انٹرویو لئے جو مختلف سوالات پر مشتمل تھے۔

ذاکرہ غوث نے ان سے جو سوالات کئے ان میں روزمرہ کی زندگی کے مسائل اور ان مسائل سے جنم لینے والی اچھائیوں اور برائیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض سوالات کے ذریعہ ذاکرہ غوث نے عبدالحق کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا رس نچوڑا ہے۔

اس انٹرویو سے ہاجرہ بیگم کی معلوماتی بصیرت، ذہنی بالیدگی، فکری موشگافیوں اور تحقیقی نظری کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

محترمہ ہاجرہ نے اپنے ابا حضور کے انتقال کے بعد مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو ایک طویل خط لکھا تھا جو ایک "نثری مرثیہ" کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس خط کا ذکر مولانا نے خاص طور پر ایک ادبی ہفتہ وار میں کیا تھا۔

محترمہ ہاجرہ بیگم کی موجودہ خاموشی کی وجہ کیا ہوگی اس کا پتہ نہیں مگر ایک اتھاہ اور گہرا سمندر پُر سکون ہو تو سمندر کی طغیانیوں اور اضطراب کے پیدا ہونے کا امکان ضرور ہوتا ہے۔ بشرطیکہ موزوں ہوائیں اس کو للکاریں۔ معلوم نہیں یہ موزوں ہوائیں ہاجرہ بیگم جیسے سمندر کو کب چھیڑیں گی اور پھر کب وہ اپنے قلم کی قدیم جولانیاں پھر سے دکھائیں گی۔ ہماری التجا ہے کہ ہاجرہ بیگم اب اس خاموشی کو توڑیں اور اپنی بابرکت شخصیت سے ایک عالم کو مستفیض کریں۔ ☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : یہ تمام خطوط ڈاکٹر ذاکرہ غوث کے ہاں محفوظ ہیں۔

(۲) : افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کی تعلیمی اور اردو خدمات از : ڈاکٹر اقبال احمد مطبوعہ 1995ء

(۳) : انشائے حق حصہ دوم مرتبہ : ڈاکٹر ذاکرہ غوث مطبوعہ ۔۔۔ء

(۴) : "حیاتِ حق کی جھلکیاں" مولفہ ڈاکٹر ذاکرہ غوث مطبوعہ ۔۔۔ء۔ اس کتاب کا ترجمہ نور الحق قادری نے تلگو زبان میں [illegible] ترجمہ کیا جو آج تک شائع نہیں ہوا۔

(۵) : "انشائے حق" جلد اول مرتب : انوار الحق ص ۷، ۸ مطبوعہ: 1982ء

(۶) : "فانوسِ خیال" سالنامہ مطبوعہ 1958ء

(۷) : اس مضمون کو عبدالقادر سروری نے پڑھا اور اس کی بے حد تعریف بھی کی ہے۔ "انشائے حق" ص 37 [illegible]

(۸) : "معیّر نسوان" کے شمارے ڈاکٹر ذاکرہ غوث کی نجی لائبریری کا خزانہ ہیں۔

جی زڈ رضیہ بیگم

محترمہ رضیہ بیگم، (دخترِ حضرت مولوی غلام حسین صاحب دلیلؔ) کی پیدائش 17 ستمبر 1933ء کو مدورائی میں ہوئی جو ٹمل ناڈو کا ایک قدیم شہر ہے جسے ہندو تہذیب و تمدن کا عظیم گہوارہ اور ٹمل زبان کا اہم ترین مرکز قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اپنے والدِ بزرگوار کی باحیات لڑکیوں میں سے تیسری لڑکی ہیں۔ (۱) عظیم المرتبت والدِ گرامی نے آپ کی تربیت اور تعلیم میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خود حضرت دلیلؔ اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں یکساں قابلیت کے حامل تھے، چاہتے تھے کہ ان کی چہیتی نورِ چشمی بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلیں اور ایک روشن ستارہ بن کر چمکیں۔ رضیہ بیگم صاحبہ نے مدراس، علی گڑھ، اور ناگپور یونیورسٹیوں سے اعلیٰ اسناد حاصل کی ہیں۔ آپ خصوصی طور پر دینیات، اردو ادب، سیاست، معاشیات، منطق اور نفسیات جیسے موضوعات سے حد درجہ دلچسپی رکھتی ہیں۔ ان موضوعات ہی میں آپ نے مختلف سندیں حاصل کرنا پسند کیا اور کامیاب ہوئیں۔ حضرت غلام حسین دلیلؔ (المتوفی 1957ء) ، اور حضرت احمد حسین صاحب قتیلؔ (المتوفی 1940ء)، حضرت محمد حسین صاحب جمیلؔ (المتوفی 1997) اس خانوادے کے وہ روشن آفتاب و مہتاب ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات سے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان سب میں حضرت دلیلؔ کی بزرگی اور اہلِ فن ہونے کے دور دور تک چرچے ہیں۔ ان کی تخلیقات ایک مدت تک تاریکی میں تڑپ رہی تھیں۔ ان کو روشنی میں لانا بہت اہم تھا اور اس اہمیت کو سمجھنے والی محترمہ رضیہ بیگم صاحبہ کے آگے ایک بہت بڑا مقصد تھا کہ وہ کسی طرح اس اہم کام کو آگے بڑھائیں۔ ان مذکورہ بزرگوں کی تخلیقات کو شائع کرکے عوام کے ہاتھوں میں تھمادیں۔ چنانچہ اپنی اور اہلِ خاندان کے دیگر افراد کی کوششوں سے ایک ادارہ '' دلیل، قتیل، جمیل فونڈیشن، مدراس 15 '' کا قیام عمل میں آیا اور اس فونڈیشن کے ذریعہ محترمہ رضیہ بیگم

صاحبہ اور ڈاکٹر ثریا بیگم صاحبہ نے ان بزرگوں کی غیر مطبوعہ اردو کتابوں (۱) اور انگریزی کتب کے تراجم کی اشاعت شروع کی۔ رضیہ بیگم صاحبہ نے " کلیاتِ دلیل " پر جو مقدمہ تحریر کیا ہے وہ ان کی اردو شناسی، اردو دوستی اور اردو پروری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ چونکہ آپ ایک عظیم باپ کی بیٹی ہیں آپ کی تحریروں میں بھی ہمیں حسبِ امید بڑی شگفتگی، سلیقہ پن، ندرت اور جاذبیت ملتی ہے۔ الفاظ کی موزونیت اور چستی آپ کی نثر کو بہت دلچسپ بناتی ہے۔ کلیاتِ دلیل کے مقدمے میں آپ کا اندازِ تحریر کچھ اس ڈھنگ کا ہے۔

" دنیا میں جو کچھ بھی چہل پہل ہے وہ جذبات کی بدولت ہے۔ اگر جذبات نیک ہوں یا بد ناپید ہو جائیں تو دنیا میں ایک سناٹا چھا جائے گا۔ آپس کے رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ ایک بے امتیازی اور بے تعلقی کا عالم پیدا ہو جائے گا۔ زندگی کی دلچسپیاں مٹ جائیں گی۔ تہذیب و تمدن کے کارخانے بند ہو جائیں گے۔ سوسائٹی کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ اور انسانیت اور حیوانیت کے بیچ صرف ایک خطِ فاصل رہ جائے گا۔ انسان کو حیوان پر جو فضیلت حاصل ہے وہ صرف عقل ہی کی بنا پر نہیں ہے۔ جذبات بھی انسانیت کا ایک طرہءِ امتیاز ہیں۔ یہی جذبات جب لفظوں کا لباس پہن لیتے ہیں تو شعر کہلاتے ہیں "۔

مذکورہءبالا نثر میں جو ستھرا پن اور سادگی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ مافی الضمیر کی ادائیگی میں موصوفہ کافی ماہر اور مشاق ہیں۔ اور ادب پر آپ کی گہری نظر دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ " شعر " کی توضیح کا یہ ڈھنگ منفرد اور چونکا دینے والا ہے۔

اسی طرح موصوفہ نے جناب احمد حسین قتیل کے ڈرامہ " جعفر برمکی " پر اپنے آباء اجداد کا ایک سوانحی خاکہ پیش کیا ہے تو اس تحریر میں آپ کا قلم ایک مؤرخ کے قلم کا روپ دھار لیتا ہے۔ اپنے خاندان کے کارناموں کو اجاگر کرنے میں جس طرح آپ کے اندر ایک تڑپ اور جوش ملتا ہے۔ اسی طرح خاندانی بزرگی کے بیان کرنے میں بھی آپ کو فخر حاصل ہے۔ یہ سارا خاندان اس لئے بہت خوش نصیب ہے کہ باہر والوں سے زیادہ اُسی خاندان کے افراد میں اس طرح کا حوصلہ، اس طرح کی دلچسپی اور استطاعت قدرت نے عطا کی ہے۔ خصوصاً رضیہ بیگم صاحبہ کے اندر یہ حوصلہ، یہ جوش اور یہ دلچسپی کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے اور دوسروں پر آپ کو ایک امتیاز بھی حاصل ہے اور وہ یہ کہ آپ بہت اچھی نثر نگار ہیں اور آپ جس بات کو کہنا چاہتی ہیں خود کہہ سکتی ہیں دوسروں سے کہلوانے کی انہیں چنداں ضرورت نہیں پڑتی۔

مذکورہء بالا سوانحی خاکہ میں ہمیں رضیہ بیگم صاحبہ کے ننھیال اور ددھیال دونوں سے متعلق بہت ساری تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔ نہ صرف اس خاندان کی بزرگی، بلکہ اس کے افراد کے طور طریقے، رہن سہن، رسم ورواج، بول چال اور رنگ ڈھنگ کا پورا خاکہ مل جاتا ہے۔ آئندہ کا محقق اگر اس خاندان کے کسی بھی فن کار یا تخلیق کار پر کام کرنا چاہے تو رضیہ بیگم کی تحریریں اُس کو بھٹکنے سے باز رکھتے ہوئے صاف ستھری تحقیق پیش کرنے کی ہدایت کریں گی۔ ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا فن کار یا تخلیق کار ہو سکتا ہے۔ رضیہ بیگم صاحبہ بہت ہی سادہ مزاج خلیق اور باوقار خاتون ہیں۔ اپنی علمی برتری کا وہ کبھی مظاہرہ نہیں فرماتیں۔ آپ کو اپنے سسرال پر بھی ناز ہے۔ آپ کے خاوندِ گرامی عالی جناب ایم۔ عبدالعزیز صاحب مدورائی کے ایک عظیم تاجر، علم دوست اور فیاض، بزرگ گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔ رضیہ بیگم صاحبہ اور ایم۔ عبدالعزیز صاحب کی ازدواجی زندگی کا آغاز 13 اکتوبر 1958ء سے ہوا اور ماشاء اللہ آپ کی اولاد میں ایک فرزندِ ارجمند اور ایک دختر نیک اختر ہیں اور اب وہ خود صاحبِ اولاد ہیں اور یہ خاندان بہ خوشی و خوبی ہر حیثیت سے پھل پھول رہا ہے۔ اس خاندان کے ہر فرد کی اخلاقی اور علمی بزرگی سے ایک خوشگوار ماحول بنتا جارہا ہے اور لوگ اس خاندان سے روز بروز مانوس ہوتے جارہے ہیں۔ اس خاندان کے بزرگوں کی کتابوں کی اجراء کے جشنوں میں شہر کے اعلیٰ اربابِ ذوق و عمل حصہ لینا اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ امید ہے کہ رضیہ بیگم صاحبہ اپنی نثر کی جولانیاں حسبِ موقعہ دکھاتی رہیں گی اور اپنے اندر کے ایک فن کار کو چھپا کر نہیں رکھیں گی۔ ☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : حضرت دلیل کے ہاں پانچ لڑکیاں اور چار لڑکے تولد ہوئے جن میں سے پہلی لڑکی اور آخری لڑکا فوت ہوگئے، بقیہ سات حسبِ ذیل ہیں۔ ۱۔ ڈاکٹر انور حسین ۲۔ حاجی قیصر حسین ۳۔ جناب افسر حسین ۴۔ الٰہی بیگم ۵۔ ڈاکٹر ثریا بیگم ۶۔ رضیہ بیگم ۷۔ رفیعہ بیگم۔ اس خاندان میں نواسے، نواسیاں، پوتے اور پوتیاں کل چوبیس ۲۴ افراد ہیں۔

(۱) : "کلیاتِ دلیل" مطبوعہ 1993ء، نعرہءِ درویش مطبوعہ 1994ء، تحفہءِ درویش 1994ء جعفر بد کلی (قتیل کا ڈرامہ) 1996ء، نغمہءِ درویش 1996ء خیابانِ قتیل 1999ء (قتیل کی شاعری) "غریب ماں"۔

سعیدہ عطاء اللہ

سعیدہ بمقام مدراس ۴ ذوالحجہ ۱۳۵۲ء مطابق ۲ مارچ ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم گھریلو روایات کے مطابق اپنے داد مولوی محمود (جو اپنے وقت کے جید عالم و فاضل تھے) اور اپنے والدِ محترم مولوی ابو سعید احمد بہاؤالدین (منتظم مدرسہء محمدی، دیوان صاحب باغ) کے زیرِ پرستی ہوئی۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ مدراس کے علمی وادبی ماحول میں گذرا۔ اعلیٰ تعلیم مثلاً بی۔اے، بی۔او۔یل، کے لئے حیدر آباد گئیں۔ اور وہیں شادی کے پاکیزہ رشتہ میں بندھ گئیں۔ حیدر آباد میں رہن سہن سے مانوس ہونے کے باوجود ان کا ذہنی رشتہ مدراس سے بہت گہرا تھا۔ عثمانیہ یونیورٹی سے بی۔او۔یل اور ایم۔او۔یل کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایم۔اے (ایک خصوصی پرچے کے لئے قاضی بدرالدولہ کا انتخاب کیا) اور ایم۔فل کی سندیں بھی حاصل کیں۔ موصوفہ نے یم۔فل "عبدالرحمٰن جبوری" پر ڈاکٹر سیدہ جعفر کی نگرانی میں کیا اور پھر سیدہ جعفر کی ایماء پر انہوں نے پی۔ایچ۔ڈی (عارف الدین خان عاجز اورنگ آبادی کی مثنوی "لعل و گہر" کی ترتیب و تدوین) کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر جامعہ عثمانیہ ہی سے پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔

سعیدہ نے جبوری کی شخصیت اور فن پر بڑی محنت، عرق ریزی اور انہماک سے روشنی ڈالی ہے۔ اس مقالے سے سعیدہ کی علمی وادبی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس موضوع پر ان کے بعد (غالباً ۱۹۸۴ء میں) بھوپال کے مشہور و معروف ادیب، نقاد اور محقق ڈاکٹر سید حامد حسین کی بیگم صاحبہ نے بھی پی۔ایچ۔ڈی کے لئے مقالہ لکھا تھا۔ شاید اس مقالے کا علم موصوفہ کو نہیں تھا۔ ورنہ اِس مقالے کے مطالعے سے مزید موصوفہ کو نئی روشنی اور نئے زاویے مل سکتے تھے۔ جس سے ان کا مقالہ اور بھی وقیع اور جامع ہو سکتا ہے۔

بہر کیف سعیدہ پہلی امیدوار (Candidate) ہیں جنہوں نے اس مقالے میں جبوری سے متعلق جو بھی مواد اکٹھا کیا ہے وہ قابلِ صد ستائش ضرور ہے۔

سعیدہ صاحبہ راقم کے لنگوٹی یار محمد انصر الدین کی بڑی بہن ہیں جن کی توسط سے آپ سے ایک دوبار ملنے کا بھی موقع نصیب ہوا ہے۔

☆☆☆

نسیمہ قدیر

نسیمہ قدیر (دختر غلام محمد) بمقام دیوان صاحب باغ، مدراس کے ایک دینی و علمی گھرانے ۱۵ رجب ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۹۳۹ء میں تولد ہوئیں۔ آپ نے عربی اور اردو کی تعلیم اپنے خاندانی علماء و فضلاء سے حاصل کی۔ سنا ہے کہ موصوفہ نے ہندی بھی امتہ الواحد شاکرہ اور ڈاکٹر ذاکرہ غوث سے پڑھی اور اس زبان پر رفتہ رفتہ ملکہ حاصل کر لیا۔ "مشیر نسوان" میں موصوفہ کے ہندی ترجمے، مضامین کی صورت میں چھپا چکے ہیں۔ نسیمہ کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی دختر افروز کو ہندی زبان و ادب کے نشیب و فراز سے بھی آشنا کرایا جس کی بدولت افروز نے کئی ایک ہندی تحریروں کو اردو میں منتقل کر کے "مشیر نسوان" کی نذر کیا۔

☆☆☆

امتہ البتول

امتہ البتول (دختر امتہ الحسنہ) مدراس میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم ہوبارٹ ہائی اسکول میں ہوئی اور وہیں سے ایس ایس ایل سی پاس کیا۔ (S.I.E.T) کالج سے بی۔اے (انگریزی) میں کامیاب ہونے کے بعد ایم۔اے، ایم۔فل (اردو) کی سندیں مدراس یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ چند سال (Gills Adarsh School) میں مدرس رہیں، پھر آپ کا تقرر بحیثیتِ ٹیچر، گورنمنٹ ہوبارٹ ہائی اسکول میں عمل میں آیا اور آج کل وہ اسی اسکول میں ہیں۔

بچپن سے اردو زبان سے محبت ہے۔ یہ محبت رفتہ رفتہ عشق میں تبدیل ہو گئی۔ سنا ہے کہ انہوں نے علمی و دینی مضامین لکھے ہیں۔ میرے سامنے موصوفہ کا صرف ایک ہی مضمون موجود ہے جو گورنمنٹ ہوبارٹ ہائی اسکول کے صد سالہ رسالے کی زینت بن چکا ہے۔ ☆☆☆

فیض النساء

فیض النساء ۲ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹ دسمبر ۱۹۴۳ء مدراس میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی ابتدائی تعلیم مدراس کی مشہور زنانہ اسکول، گورنمنٹ ہوبارٹ ہائی اسکول میں ہوئی۔ آپ ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی اور میٹرک کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد (Teacher Training) ڈپلومہ سے سرفراز ہوئیں۔ ۱۹۶۵ء میں وانم باڑی کے "مدرسہ ء نسوان" میں صرف ایک سال کے لئے حیثیتِ اردو منشی تدریسی فرائض انجام دیئے۔ حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے وانم باڑی کو خیرباد کہااور مدراس آگئیں۔ یہاں آکر ۱۹۶۸ء سے مدراس کارپوریشن گرلس ہائی اسکول میں درس و تدریس کا پیشہ اپنایا۔ ۱۹۸۰ء کے شروعات میں آپ نے خود ہی وظیفہ یاب ہو جانا پسند کیا۔

فیض النساء نے ہمیشہ علمی و ادبی معرکوں میں بھرپور حصہ لیا۔ روزمرہ زندگی کے مسائل کو قلم بند کرنے کا ان میں بھرپور سلیقہ موجود تھا۔ اُن کے اکثر مضامین چونکا دینے والی کیفیات کے حامل ہیں۔ موصوفہ کے مضامین ماہنامہ " حریم "لکھنؤ اور ماہنامہ "عصمت" دہلی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اردو شاعری سے بھی ان کا دلی لگاؤ تھا۔ مدراس کے شعراء ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اپنے مصرفِ خاص سے دوست و احباب کے گھروں میں مشاعرے منعقد کرنا اور مدراس کے شعراء کے کلام کو بڑی متانت اور سنجیدگی سے سن کر محفوظ ہونا آپ کی زندگی کا ایک شعار بن گیا تھا۔ اس طرح کی خواتین مدراس کے ماحول میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ بہر کیف پس پردہ موصوفہ نے اردو شاعری اور اردو شعراء کی بڑی ہمت افزائی اور پذیرائی کی ہے۔

☆☆☆

نعیمہ پرویز

نعیمہ پرویز کی پیدائش ۲۳ مئی ۱۹۴۴ء کو وانم باڑی (شمالی آرکاٹ) میں ہوئی۔ آپ نے مقامی مدرسہ میں ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد جامعہ علی گڑھ سے "ادیبِ کامل" اور مدراس یونیورسٹی سے "ادیبِ فاضل" اور ایم۔اے (اردو) کی سندیں حاصل کیں۔ آپ تقریباً تیس سال سے اسلامیہ گرلز ہائیر سکنڈری اسکول، وانم باڑی میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ انہیں بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق رہا ہے۔ وہ رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادی ہیں۔ اپنے اس شوق کے باعث آپ کو اردو ادب کی ہر صنف سے واقفیت حاصل ہوئی۔ اور خصوصاً غزلوں اور نظموں میں آپ کو بہت زیادہ جاذبیت دکھائی دی۔ طبیعت بھی موزوں تھی۔ اس لئے خود بھی شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا میں انہوں نے بچوں کے لئے نظمیں کہنے ہی کو اپنا شعار بنایا۔ آپ کو یہ اعتراف ہے کہ ابتدا میں ان کی شاعری قواعد و ضوابط کی نا آشنائی کے باعث خود کو مطمئن نہیں کر رہی تھی۔ مگر انہوں نے بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ مشقِ سخن کو جاری رکھا اور بہت جلد آپ صحیح راستے پر بھی گامزن ہو گئیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ آپ اپنی شاعری کی نوک پلک درست کرنے کے لئے حضرت اختر نجمی حیدر آبادی کی طرف رجوع ہوئیں۔ اُن سے اپنی دو ایک غزلوں پر اصلاح بھی لی، مگر آپ نے اس سلسلے کو جاری نہیں رکھا اور خود اپنی ڈگر پر چل پڑیں۔ غزل آپ کی محبوب صنفِ سخن ہے ویسے آپ نے حمدیں، نعتیں، اور سلام بھی کہے ہیں۔ آپ کی تمام تر تخلیقات میں روایت کی پاس داری اور اس کی صالح قدروں کا احساس نمایاں ہے۔ آپ کا ایک افسانہ "دو دن کی محبت" ماہنامہ "خاتونِ مشرق" نئی دہلی میں چھپا ہے اور ایک اور افسانہ ماہنامہ "ماتا"، "ہتول" میں جگہ پایا ہے۔ یہ دونوں افسانے ہلکے پھلکے موضوعات ہی کو گرفت میں لاتے ہیں۔ اول الذکر افسانے میں انہوں نے آج کل کے نوجوانوں کے عشق کی نوعیت پر روشنی ڈالی ہے۔ موخر الذکر میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس کی شادی

خوبصورت نہ ہونے کی بنا پر بہت دیر سے ہوئی تھی اور ایک بچی کو جنم دیتے ہی چل بسی تھی اور وہ بچی ماما کے لئے ترستی رہ گئی تھی۔

شاعری میں نعیمہ پرویز غالب، مومن اور اقبال سے بہت متاثر ہیں۔ اسی تاثر کی بنا پر وہ ہمیشہ اردو شاعری کی قدیم روایات کی پاسدار رہی ہیں۔ راقم الحروف کے کہنے پر موصوفہ نے بطورِ نمونہ چند غزلیں اور نعتیں ارسال کیں۔ آپ کی فراہم کردہ تخلیقات کو سامنے رکھ کر راقم نے آپ سے متعلق کچھ کہنے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔

فن کاروں سے متعلق راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا فن کار بن سکتا ہے۔ نعیمہ پرویز کے تعلق سے راقم کی یہ رائے صرف اس کی اپنی رائے نہیں ہے بلکہ جس سے بھی محترمہ کے بارے میں پتہ چلا ہے اُس سے اس اعتبار کو مزید تقویت ملی ہے کہ وہ بڑی پُر خلوص انسانیت پسند اور اخوت و مروت کی دلدادہ ہیں۔ کسی کے دل کو انہوں نے کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی ہے۔ نعیمہ پرویز کی اس فطرت کا اظہار اُن کے اشعار میں اس طرح ہوا ہے۔ ؎

آپ تو آپ ہیں عدو کو بھی — ہم کبھی بد دعا نہیں کرتے

جنھوں نے آڑ میں الفت کی ہم پہ وار کیا — بڑے خلوص سے اُن سے بھی ملتے ہیں پرویزؔ

مہر و اخلاص کا وہ مخزن ہے — دل پرویزؔ جس کو کہتے ہیں

نعیمہ پرویزؔ جو کچھ بھی کہتی ہیں، اُس پر کسی کی تنقید کی انہیں نہ تو فکر ہوتی ہے نہ اُس کا خوف۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں لفظوں کے استعمال میں وہ غیر محتاط سی نظر آتی ہیں۔ شعر کہتے وقت جو لفظ پہلی بار اُس کے ذہن میں عود کر آیا اُسی کو کھپا دیا۔ اس سے بہتر کی انہیں تلاش نہیں ہوتی۔ اس طرح تیزی سے اپنے خیال کو صفحہء قرطاس پر اتار کر وہ مطمئن سی ہو جاتی ہیں۔ اُن کا اظہار، انداز اور شعر گوئی کا رویہ خود پروردہ ہے۔ انہوں نے روایت سے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے خوشہ چینی کی ہے۔ جدید ادب کا وہ مطالعہ کریں گی تو اُن کی شعری صلاحیت کے پیشِ نظر یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے وہ بلند پروازی پر آمادہ ہو جائیں گی۔

نعیمہ پرویزؔ جیسی صاف گو شاعرہ سے ٹمل ناڈو کو بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ ان کے کلام کی کئی جھلکیاں پیشِ نظر مختصر سے صفحات پر بکھری غزلوں میں مل جاتی ہیں۔ ان کے یہ اشعار واقعی دل پر ایک گونہ اثر نقش کرتے ہیں۔

ہم کو خوشیاں نہ راس آئی ہیں — آرزو کو سجا کے دیکھ لیا
آتش غم نہ ہو سکی ٹھنڈی — ہم نے آنسو بہا کے دیکھ لیا
داغہائے کہن نکھر جاؤ — سونا سونا سا دل کا آنگن ہے
دل پرویز جس کو کہتے ہیں — مہر و اخلاص کا وہ مخزن ہے
ہمارے زخم کفِ پا کی خوں فشانی نے — زمینِ دشت کو سر سبز و لالہ زار کیا
سنانے بیٹھ گئے اُس کو حالِ دل اپنا — ذرا سی جس کے رویہ میں دلدہی پائی
کہہ دو تو اٹھ ہی جائیں گے محفل سے ہم ابھی — کب تک تمہاری نظروں میں کھٹکیں گے خار سے
زندگی کے کٹھن مراحل میں — مشکلیں گر نہ ہوں مزا کیا ہے
جیتے جی کیسے چھوڑوں ناصح — شاعری میرے دل کی دھڑکن ہے

نعیمہ پرویز کے کلام میں عشقیہ مضامین کی کثرت ہے۔ اُس کا سبب جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہی ہے کہ روایتی شاعری کا ان کے ذہن پر گہرا اثر ہے۔ نعیمہ پرویز نے نہ معلوم شاعری کی اور کن کن اصناف میں طبع آزمائی کی یا تجربہ کیا ہے۔ عام شعراء کی طرح انہوں نے بھی ہر ایک صنف کو چھو لینے کی ضرور کوشش کی ہوگی۔ نعت گوئی کی طرف بھی اُن کا دھیان گیا ہے۔ اُن کی نعتیں حضورِ اکرم ﷺ سے عقیدت واحترام کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی نعتوں کے ایک دو شعر بھی اُن کی شفاعت کے ضامن بن سکتے ہیں۔ اُن کے یہ اشعار اُن کے جذبہء احترام کو اجاگر کرتے ہیں۔

خاکِ طیبہ جنہیں نصیب ہوئی — وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں
عاشقِ رحمتِ دو عالم کو — دونوں عالم نصیب ہوتے ہیں

امید ہے کہ موصوفہ کی صاف ستھری شاعری نعت گوئی میں بھی اپنی قابلیت قائم کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

نعیمہ پرویز سے متعلق پروفیسر سید جلال عرفان کی رائے بڑی اہم ہے اس لئے کہ موصوف نے بہت قریب رہ کر انہیں تلاشا اور پرکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"نعیمہ پرویز کی شاعری غمِ ذات کی حکایت ہے"۔

اس مختصر سے تاثر میں ایک طوفان خیز احساسات رکھنے والی نعیمہ پرویز کی شاعری پر سے بہت سے پردے اٹھتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں "میں" اور "وہ" کی ضمیریں بالکل حقیقی ہیں۔ وہ اپنے بالکل محدود سے ماحول میں بہت کچھ بن کر بری طرح ٹوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ

ایک مشرقی عورت ہیں۔ اور ہر مشرقی عورت کا شعار شوہر کی وفادار اور خدمتِ اقرباء ہوا کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے شوہر تبسم رشید مرحوم کے ساتھ زندگی کی ہر پیچ وخم کا مشاہدہ کیا ہے۔ اُن کے ہاں " وہ "کبھی تبسم رشید ہی کے لئے ہوتا ہے اور کبھی کبھی" وہ "ایک ایسے قریبی شخص کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے جس سے انہوں نے کسی طرح کی زک پائی ہو۔ ضمیر " وہ "کبھی کبھی مخاطب کی ضمیر " تم" اور " آپ "میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اُن کے یہ اشعار سچائی کے آئینہ دار ہیں۔

پشیماں ہیں ہم اُن سے فریاد کر کے وہ اتراتے ہیں ہم کو برباد کر کے
آپ کا یہ عتاب بھی منظور ہاں یہ کہہ دیجئے خطا کیا ہے
تم نہ نادم جفاؤں پر ہونا مجھ کو عادت ہے بھول جانے کی

تبسم رشید کی وفات کے بعد وہ ٹوٹ کر بھی پوری طرح نہ ٹوٹ پائیں۔ اُن کا یہ حوصلہ اُن کو اس طرح کہنے پر مجبور کرتا ہے۔

ہم الم کو خوشی سمجھ کے سہا بگڑی تقدیر یوں بنائی ہے
کر لو نظارہ اے جہاں والو برق کی زد میں میرا خرمن ہے
جو سفینوں کا ہے خدا حافظ وہ بھور میں پھنسا نہیں کرتے

اور اپنی تقدیر آپ بنانے والی نعیمہ پرویز ٹمل ناڈو کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جانے کی حق دار ہیں۔

☆☆☆

کاظمہ بیگم

کاظمہ کے آباواجداد کا گھر ارشتہ مدراس سے ہے۔ آپ کی پیدائش ۳ شعبان ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹ جولائی ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ ان کے والد مدراسی تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد گئے اور وہیں کاظمہ بیگم پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم حیدر آباد کے مدارس اور عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں بی۔اے کرنے کے بعد شادی کے بندھن میں بندھیں۔ شادی کے چند سال بعد اپنے شریکِ حیات کے ساتھ مدراس آئیں اور مستقل طور پر یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔

عربی اور اردو زبانوں پر دستگاہ رکھتی ہیں۔ اردو مضامین لکھنے کا شوق ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں انہوں نے جو ہلکے پھلکے مضامین لکھے، وہ "اخبارِ خاتون" ممبئی میں شائع ہو چکے ہیں۔ "مشیر نسوان" میں بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا ان کا مشغلہ تھا۔ ☆☆☆

فاطمہ رئیس

فاطمہ رئیس صاحبہ کا اصلی نام فاطمہ بیگم ہے۔ ان کی پیدائش ۱۹۴۸ء میں مدراس کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ (۱) انہوں نے گورنمنٹ ہوبارٹ ہائیر سکنڈری اسکول فار مسلم گرلس مدراس سے ۱۹۶۰ء میں (S.S.L.C) کیا تو انہیں اردو میں امتیازی درجہ پانے پر سرکار کی جانب سے ایک چاندی کا تمغہ اور سند سے سرفراز کیا گیا۔ یہ دونوں اعزازات اُس وقت کے وزیرِ تعلیم سی سبرا نیم (آنجہانی) کے ہاتھوں سے نوازے گئے۔ اس نوازش کے باعث موصوفہ کی بڑی ہمت افزائی ہوئی اور اردو زبان سے اُن کی محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ ۱۹۶۴ء میں وہ ایتھراج کالج کی طالبہ رہیں، اُسی دور میں ڈاکٹر ذاکرہ غوث وہاں اردو کی پروفیسر تھیں۔ ڈاکٹر ذاکرہ غوث کو فاطمہ رئیس پر بڑا ناز ہے۔ کالج کی تعلیم کے دوران ۱۹۶۲ - ۱۹۶۱ میں انٹر کالجیٹ تقریری مقابلے میں فاطمہ رئیس نے حصہ لیا اور دوسرا انعام حاصل کیا۔ اور پھر ۱۹۶۳ - ۱۹۶۲ء میں اسی نوعیت کے تقریری مقابلے میں انہوں نے پہلا انعام حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور وہ کامیاب بھی ہوئیں۔ اسی دور میں گورنمنٹ آرٹس کالج کی جانب سے نعیم الرحمٰن رولنگ کپ کے لئے اردو تقاریر کے مقابلے ۱۹۶۲ - ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۳ - ۱۹۶۲ء میں ہوئے ان میں بھی حصہ لے کر انہوں نے پہلے سال پہلا انعام اور دوسرے سال دوسرا انعام پایا۔ اس طرح تقاریر میں حصہ لینے کی وجہ سے موصوفہ شہر بھر کے کالجوں پر چھائی رہیں۔

فاطمہ رئیس نے اپنے آپ کو محض تقریری صلاحیتوں تک محدود نہیں رکھا، بلکہ تحریری طور پر بھی حسبِ موقعہ آپ میں تحرک پیدا ہو جاتا اور وہ اپنے قلم کی جولانیاں دکھانے لگتیں۔ ۱۹۶۲ - ۱۹۶۱ میں موصوفہ نے ایتھراج کالج میگزین کے لئے اپنا ایک مضمون " زندگی اور ہم" شائع کیا اور اسی سال پریسیڈنسی کالج میگزین " ضیا" میں ان کا ایک اور مضمون " بہترین انسان " کے عنوان سے جگہ پایا۔ یہ دونوں مضامین اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ تحریری طور پر بھی موصوفہ نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ۱۹۶۴ میں " بزمِ علم و

ادب'' کے زیرِ اہتمام مختلف عناوین پر مباحثات منعقد کئے گئے تھے، جس کی صدارت مولانا مولوی غلام محمد مہدی خان نے کی تھی۔ اس ادارے کی کارگذاریوں میں حصہ لینے کے لئے راقم الحروف اور محمد فضل الدین جاوید دونوں کی ہدایت پر موصوفہ نے '' تجارتی شادیاں'' کے عنوان پر تحریری مقابلے میں شرکت کی۔ اس مقالے کو جناب عباس علی خان ضیا نے سامعین کے گوش گذار کیا اور موصوفہ کو پہلا انعام ملا۔ اس مقالے کے چند اقتباسات حسبِ ذیل ہیں۔

'' شادی ایک ایسا مدھر لفظ ہے جس میں کئی آشائیں، اچھائیں اور امنگیں چھپی ہوئی ہیں۔ جس کو سن کر دادا ابا اور دادی امی کا جھریوں بھرا چہرہ بھی کھل اٹھتا ہے۔ جس کو سن کر ایک ماں اپنے تصور میں اپنی بیٹی کو عروسی لباس میں شرمائی، لجائی اور بیٹے کو سہرے میں دیکھتی ہے۔ جس کا نام سنتے ہی ایک بیوہ اپنی ماضی کی سنہری وادیوں میں بھٹکنے لگتی ہے، جس کو سن کر ایک نوخیز حسینہ کا انگ انگ رقص کرنے لگتا ہے، جو روحوں کا بندھن ہے جس کو مسلمان سنت اور ہندو جسم کا بندھن کہتے ہیں، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ جسم کا بندھن، یہ سنت رسولؐ، اب محض ایک تجارت بن کر رہ گئی ہے۔ لڑکی چاہے خوبصورت ہو یا تعلیم یافتہ، لیکن پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ '' لین دین'' کیا ہے ؟ بھلا آپ ہی بتایئے کیا ''لین دین'' تجارت نہیں ہے ؟ ہم آج بھی ایسی خبریں سنتے آرہے ہیں جیسے بارات واپس چلی گئی، اس لئے کہ لڑکی کے باپ نے ریڈیو نہیں دیا، بارات واپس چلی گئی۔ اس لئے کہ جہیز میں کمی تھی اور لڑکی نے زہر پی لیا ''۔

مذکورہ بالا تحریر سے آج سے تیس سال پہلے کی ہے، مگر ان کی تحریر کا رنگ اُن دنوں بھی کتنا دلکش، نکھرا ہوا اور قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے والا ہے۔ ایسی تحریروں کے باعث آپ کے اندر کی پُر ہمت انا انہیں کالج کے میگزینوں کے لئے افسانے لکھنے پر بھی اکسایا۔ ایتھراج کالج میگزین کے لئے اُن کا ایک افسانہ ۶۴ - ۱۹۶۳ میں '' پرائشچت'' کے نام سے اور اسی سال پریسیڈنسی کالج کے سالنامہ '' ضیا '' کے لئے ایک مضمون ''سیوا میں شکتی'' آپ نے تحریر کیا۔ اگر آپ چاہیں تو انہیں ادبی رسائل اور جرائد میں شائع کرا کے بڑے پیمانے پر خراجِ حاصل کر سکتی تھیں، مگر نہیں معلوم آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

گریجویشن کے بعد آپ نے تدریسی پیشے کو اپنے کے لئے موزوں سمجھا۔ اس لئے ۱۹۶۵ میں انہوں نے (B.T) کی سند حاصل کی اور اسی سال جون میں گورنمنٹ ہوبارٹ ہائیر سکنڈری اسکول میں کیمسٹری اور ریاضی کی معلّمہ کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۹۷۱ میں آپ کا تبادلہ گورنمنٹ سکنڈری اسکول، جارج ٹاؤن کو ہو گیا۔ ۱۹۷۷ میں آپ نے تروپتی یونیورسٹی سے اردو میں یم۔اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۷۸ میں پی۔جی اسسٹنٹ (اردو) کی ترقی ملی اور واپس ہوبارٹ ہائیر سکنڈری اسکول آگئیں۔ ۱۹۷۹ میں (M.Ed) کیا اور پھر مدراس یونیورسٹی سے یم۔فل کی سند حاصل کی یم۔فل کے لئے مدراس یونیورسٹی سے ریگولر اسکالر شپ پر آپ نے "ڈاکٹر عبدالحق - حیات اور کارنامے" کے موضوع پر مقالہ پیش کیا جس کی سرپرستی ڈاکٹر نجم الہدیٰ جیسی فعال ہستی نے کی۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر ذاکرہ غوث صاحبہ یم۔لٹ کرنا چاہتی تھیں، مگر موصوفہ کو اس کو اجازت ملنے میں کافی تاخیر ہوئی۔ فاطمہ رئیس صاحبہ کا کہنا ہے کہ اس مقالے کی تیاری میں ڈاکٹر ذاکرہ غوث کی اعانت پوری طرح حاصل ہوئی۔ اور ان کے اس موضوع کے پس منظر میں وہی موجود تھیں۔ البتہ انہیں پروفیسر محبوب پاشا محبوب کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے فرزندوں اور دختر ہاجرہ بیگم کا بھی بھرپور تعاون حاصل تھا۔ اس مقالے کی تحریر کے دوران فاطمہ رئیس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی موضوع پر ایک طالب علم اقبال احمد نے موصوفہ کے مقالے سے استفادہ کرتے ہوئے پی۔ایچ۔ڈی کی سند سری وینکٹیسورا یونیورسٹی، تروپتی سے حاصل کی۔

آج کل موصوفہ گورنمنٹ ہوبارٹ ہائیر سکنڈری اسکول کی میر مدرسہ ہیں۔ جس وقت اس اعلیٰ عہدے پر پہنچی ہیں، تب سے اسی کوشش میں ہیں کہ مدرسہ کی لڑکیاں اردو ہی کو ذریعہء تعلیم بنائیں اور انہیں پوری سہولتیں مہیا ہوں۔ مدراس کی فضا اردو کے تعلق سے آج کل اتنی مکدر اور بھیانک ہو گئی ہے کہ والدین کو یہ خوف لگا رہتا ہے کہ ذریعہء تعلیم اردو ہونے کے باعث آئندہ چل کر ذریعہء معاش کے لئے سرکاری ملازمتیں حاصل کرنا دشوار ہو جائے گا۔ ایسے ماحول کو دیکھ کر موصوفہ پوری دل جمعی سے کام لیتے ہوئے اپنے مدرسے کی استانیوں کو گھر گھر روانہ کرتی ہیں اور یہ پیغام دیتی ہیں کہ اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے اور ان کا خوف بے جا ہے۔ ان کے اس پیغام کے باعث آج ان کے مدرسے میں اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والی بے شمار لڑکیاں مستفیض ہو رہی ہیں جب کہ مدراس یونیورسٹی ہی میں گراں تنخواہ پانے والے پروفیسر اپنی نوکریوں کی حالی کے لئے دو ایک طالب علموں کو کمند پھینکا کر پھانس لیتے ہیں اور اس پر زعم یہ کہ انہیں کے باعث

مدراس میں اردو زندہ ہے۔

آج بھی موصوفہ کچھ نہ کچھ تحریری کام کر رہی ہیں۔ حال ہی میں اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود آپ کا ایک مضمون "میں اردو ہوں" کے عنوان سے ہوبارٹ اسکول کے "سلور جوبلی سوونیر" میں شائع ہوا ہے اور اس مضمون میں جہاں اردو اپنی زبانی اپنی موجودہ صورتِ حال کی نالاں دکھائی دیتی ہے، وہیں یہ مضمون موصوفہ کے طنز کی بہترین عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> "ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے آپ کو اردو کا علم بردار کہتے ہیں، اپنے مفاد کے لئے ادبی محفلیں سجاتے ہیں، اکیڈمی بنانے کی کوشش کرتے ہیں، مشاعرے منعقد کرتے ہیں۔ ایسی محفلوں کو اردو کی چہلم یا برسی کے فاتحہ کی محفلیں کہا جاسکتا ہے۔ دھواں دھار تقریریں کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ اردو کی ترقی کے خواہاں نہیں، لیکن ان کے قول و فعل میں فرق ہے، کیونکہ ان کی اولاد خود اردو سے نابلد ہے۔............"

اور آخر میں موصوفہ کہتی ہیں کہ "ایسے لوگوں" سے وہ فلمیں بہتر ہیں جن سے لوگ اردو کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ فاطمہ رئیس صاحبہ اب اپنی صلاحیتوں کو دیگر نشریاتی ذرائع سے اور عظیم ادبی جرائد اور رسائل کے ذریعہ اجاگر کریں گی۔ آپ کی خاموشی سے ٹمل ناڈو کی خواتین میں ایک بہت بڑا خلا ہنا رہے گا۔

☆☆☆

حوالہ

(۱) مدراس کے عظیم مدرسین حضرت خواجہ رئیس الدین کا مقام و مرتبہ نہ صرف بہت اونچا ہے بلکہ عوام میں بھی آپ کی اردو شناسی اور اردو دوستی بہت معروف و مقبول ہے۔ آپ گورنمنٹ مدرسہ اعظم میں کیمیا کے بہترین استاد (پی۔جی۔اسسٹنٹ) رہ چکے ہیں اور اسی مدرسے میں نائب صدر مدرس بھی تھے۔ حال ہی میں آپ وظیفہ یاب ہوئے ہیں۔ وظیفہ یابی کے بعد آپ مختلف اداروں کی سرپرستی میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ میلاد النبیؐ کے تقریری مقابلے منعقد کرنے میں آپ کی دلچسپی کی داد دینی چاہئے۔ موصوف سے فاطمہ بیگم اپنی ازدواجی زندگی میں خوش و خرم ہیں۔ اسی لئے آپ فاطمہ رئیس سے موسوم ہیں۔ خواجہ رئیس الدین بہت ہی خوش بیاں، خوش مزاج اور ظریف الطبع انسان ہیں۔ جس سے بھی ملتے ہیں، اُس سے دل موہ لیتے ہیں۔

رفعت یاسمین

رفعت یاسمین دختر محمد غوث کی ولادت حیدر آباد میں ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ غالباً تین سال حیدر آباد میں رہنے کے بعد اپنی والدہ ڈاکٹر ذاکرہ غوث کے ہمراہ مدراس آئیں اور ہمیشہ کے لئے یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک مدراس ہی کے ماحول میں حاصل کی۔ یم۔اے (انگریزی) سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی سے کرنے کے بعد مدراس یونیورسٹی سے یم۔ فل پاس کیا۔ ایم۔ فل میں ان کا موضوع "خواجہ احمد عباس کی تحریروں میں انسانی دوستی" تھا۔ موصوفہ نے خواجہ احمد عباس کا تمام تر مواد اردو سے حاصل کرنے کے بعد اس مواد کو شاید انگریزی ادب کی تاریخ میں پہلی بار پیش کرنے کی جسارت اور کامیابی بھی حاصل کی۔

رفعت کا اردو سے گہرا لگاؤ ہے۔ انہوں نے اپنے بچپن میں جو مختصر کہانیاں لکھی تھیں، وہ ماہنامہ "کلیاں" لکھنؤ اور مقامی قلمی رسالے "مشیر نسوان" میں جگہ پا چکی ہیں۔ ویسے بھی انہیں اردو زبان وادب ورثہ میں ملا ہے۔ آج کل وہ سعودی عرب میں مقیم ہیں اور اردو میں ان کی تحریریں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

☆☆☆

امیر النساء

امیر النساء کی پیدائش گڑیاتم (ضلع شمالی آرکاٹ) نامی شہر میں 1950ء میں ہوئی۔ آپ کے والدِ محترم اے حبیب الرحمٰن صاحب شہر کے ایک متمول بزرگ تھے جن کا پورا خاندان علم دوست اور اردو زبان وادب کا دلدادہ تھا۔ امیر النساء کی ابتدائی تعلیم حسبِ دستور اپنے گھر سے ہی شروع ہوئی۔ لازماً ناظرہ قرآن خوانی اور اردو تعلیم گھر ہی کے بزرگوں سے حاصل ہوئی۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے کسی درس گاہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہو۔ البتہ کسی قابل استاد کے ماتحت بھی آپ کی ذہنی اور روحانی پرورش ہوئی ہو گی۔ تبھی ان میں اردو ادب کی انست کوٹ کوٹ کر بھر گئی۔ ان کا خاندان چونکہ بہت متمول تھا اس لئے ان کی تعلیم پر ان کے بزرگوں نے بہت زیادہ دھیان دیا ہو گا۔ سخت پردہ اور ماحول کے مطالبات کے باعث کہیں دوسروں سے ملنے جلنے کے مواقع بہت کم نصیب تھے۔ مگر گھر میں آنے والے جرائد، رسائل اور کتب کے مطالعے سے امیر النساء کے اندر بھی اُس دور کے زندہ معاشرے کی پوری شناخت در آئی۔ اردو ادب کی تاریخ اور اس کی نشو نما کا مطالعہ ان کے اندر فکری جولانیاں بھر تا گیا اور اردو کی ہر صنف کو پڑھنے، پرکھنے کی سوجھ بوجھ ان میں پیدا ہوتی گئی۔ جب وہ الحاج ایس۔ یم۔ ضیاء الدین احمد (فرزندِ رئیسِ میل وشارم الحاج ایس۔ یم۔ جمیل صاحب) کی رفیقِ حیات بنیں تو ان کے اندر کے جوہر کو اُبھرنے میں مزید مواقع نصیب ہوئے۔ کیونکہ موصوف ضیاء الدین احمد سی عبدالحکیم، میل وشارم کے کرسپانڈنٹ ہی نہیں تھے، بلکہ مقامی اور بیرونی کئی تعلیمی اداروں کے باعمل رکن بھی تھے۔ اس لئے اس کالج کو یا نجی طور پر ضیاء الدین احمد کو جو بھی کتابیں اور رسائل ملتے تھے ان پر امیر النساء کی نظر ضرور پڑتی اور مزید ان کی علمی اور ادبی پیاس کو مٹانے کے مواقع نصیب ہوتے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ میاں بیوی دونوں ہم خیال بھی تھے۔ اس لئے کہیں کسی قسم کی رکاوٹ یا تنازعہ نہیں پیدا ہوتا۔

شادی سے پہلے بھی امیر النساء کو کچھ نہ کچھ لکھنے کی دھن سوار رہتی۔ جو بھی لکھتیں، اپنے گھر والوں اور سہیلیوں کے روبرو پیش کرتیں اور خراجِ تحسین حاصل کرتیں۔ شادی کے بعد ان کا رنگ اور نکھر گیا اور وہ خصوصی طور پر افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئیں۔ ان کے آگے موجودہ سماج آئینہ کی طرح موجود تھا۔ اس لئے ان افسانوں کے موضوعات حقیقت پر مبنی ہوتے۔ غلط رسم ورواج، غلط عقائد، غلط رویے، اور بے جا عمل اور ردِ عمل کو وہ بذاتِ خود دیکھتیں اور محسوس کرتیں۔ اس لئے ان موضوعات پر قلم اٹھانے کی اہمیت ان پر اجاگر ہوئی۔ '' ہد کتاب '' کے افسانوں کا مطالعہ کریں تو مذکورہ بالا تمام باتیں قاری پر عیاں ہوجاتی ہیں۔ خصوصی طور پر ان کا موضوع سماج کی عورت ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ یہ عورت بہترین خاتون ثابت ہو جس سے آنے والی نسلوں کی صحیح تربیت وپرداخت ہو۔ چونکہ خود وہ عورت تھیں، اس لئے عورت کی نفسیات تو بخوبی جانتی اور بھانپتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک موثر افسانہ نگار بن کر ابھریں۔ ایک عرصے کے بعد افسوس کہ ان کے نام کو ٹمل ناڈو سے کیا گڑیاتم کے مضافات سے بھی باہر نہیں لے جایا جاسکا۔ شکر ہے کہ ایک عرصے کے بعد جب '' عنبریں '' نامی ناول شائع ہوا تو ان سے ایک زمانہ واقف ہوا۔

ابتدا میں وہ '' امیر النساء '' کے نام سے ہی لکھتی رہیں، مگر بعد میں اپنے شوہر کے نام سے منسوب کرتے ہوئے خود کو انہوں نے '' امیر الضیاء '' میں تبدیل کر دیا۔ '' ہد کتاب '' سے پہلے '' عنبریں '' ناول تخلیق پا چکا تھا، جن میں ان کا نام '' امیر الضیاء '' تھا، مگر '' ہد کتاب '' کی اشاعت تک پہنچتے پہنچتے پھر خود کو امیر النساء '' کے نام سے معروف کرنا بہتر سمجھا۔ نہیں معلوم اس کی وجہ کیا تھی...... اور ممکن ہے آبائی نام کی اہمیت پیشِ نظر رہی ہوگی۔ ازدواجی زندگی میں ہمیشہ خوشی اور مسرت ان کے قدم چومتی رہی۔ امیر النساء کو اللہ تعالیٰ نے اولاد سے بھی سرفراز کیا۔ دولڑکے ابرار احمد اور افتخار احمد اور ایک لڑکی الماس فاطمہ آپ کے لئے صالح ثابت ہوئے۔ اُن کی تعلیم وتربیت میں امیر النساء نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی جس کا ذکر موصوفہ نے راقم کے نام اپنے ایک نجی مراسلے میں اس طرح کیا ہے کہ اپنی اولاد کی تربیت اور شوہر کی خدمات کے باعث لکھنے پڑھنے کے مواقع اب بہت کم نصیب ہورہے ہیں۔ یہ ہر اچھے اور معتبر فن کار کا المیہ ہے اور اگر وہ فن کار عورت ہو تو پھر اس کی ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ موصوفہ اپنی اولاد کو ویسے ہی زندگی کے کردار بنانا چاہتی تھیں جیسے ان کے افسانوں میں اُن کی تمنا اور آرزو تھی۔ اس میں کماحقہٗ

وہ کامیاب بھی ہوئیں۔

ان کے افسانوں میں سے دوافسانوں پر اجمالی طور پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

" دلِ ناداں" نامی افسانے میں عائشہ کی شگفتگی اور پژمردگی دونوں وجوہات کے ایک لانیحل معمہ کو امیر النساء نے ایک حدیثِ شریف کے ذریعے حل کیا ہے۔ اس طرح امیر النساء کے مذہبی مزاج کا ایک خوش گوار پہلو ہمارے روبرو اُبھر تا ہے۔

ہمیں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اکثر افسانوں کی اہم خاتون کردار خود امیر النساء ہی ہیں۔ وہ اتنی محنتی ہوں گی جتنی " درد کا احساس" کی صبا...... گھریلو کاموں میں وہ بھی اتنی ہی چابک اور پھرتیلی ہوں گی جتنی عائشہ یا صبا ہیں۔

امیر النساء کے افسانوں کو پڑھنے سے ایک طرح کی روحانی فرحت بھی حاصل ہوتی ہے۔ بہت کم افسانہ نگار اس طرح کی روحانی فرحت بخش سکتے ہیں۔ اُن کے افسانے زیادہ طویل نہیں ہوتے اس لئے قاری کو ذہنی طور پر کسی طرح کی ورزش نہیں کرنی پڑتی ہے۔

" بند کتاب" پر امیر النساء نے پروفیسر عابد صفی سے مقدمہ لکھوالیا ہے۔ اس مقدمے کے بغیر بھی وہ اس "بند کتاب" کو قاری کے روبرو پیش کر کے اس سے بہتر تاثرات حاصل کر سکتی تھیں۔ قاری کے ذہنی تاثرات ہی اس مقدمے سے بہتر ثابت ہوتے، ویسے مشکوک پروفیسروں کے مقدمے بھی مشکوک ہوتے ہیں۔ کاش وہ کسی سے رائے لیتیں۔

امیر النساء کا ناول " عنبریں " ٹمل ناڈو کے خواتین ناول نگاروں میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے قبل کسی اور خاتون کے ناول کا ثبوت نہیں ملتا۔

عموماً ناول نگار کسی قیاسی ماحول کے عوض قاری کے قریب ترین مانوس ماحول کو پیش کرنے کی اس لئے کوشش کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن غیر مانوس ماحول کے دلدل میں نہ پھنس جائے۔ پریم چند کے افسانوں سے لے کر موجودہ آخری افسانہ نگار تک یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ افسانوں یا ناولوں کے پلاٹ میں گلیوں، سڑکوں، شہروں، اداروں وغیرہ کو بالکل حقیقی طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ منٹو نے ممبئی کی سڑکوں، ہوٹلوں، چالوں اور عمارتوں کا جو حقیقی پس منظر پیش کیا ہے، وہ افسانے کے تاثر میں ایک پلس پوائنٹ (Plus Point) ہے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، جیسے قد آور افسانہ نگار اور ناول نگار اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔

" عنبریں " میں امیر النساء نے بھی قاری سے قریب ترین ماحول ہی کو پیش کرنے کی

کوشش کی ہے۔ ٹمل ناڈو کا کوئی بھی قاری اس سے حظ اٹھا سکتا ہے نیز ایک غیر علاقائی قاری کے لئے یہ ماحول ایک تعارف کا ذریعہ بنتا ہے۔ آج دنیا سکڑ گئی ہے اور ہندوستان کے چپے چپے سے لوگ واقف ہوتے چلے ہیں۔ امیر النساء کو کسی قیاسی ماحول کی ضرورت کیوں پیش آئے۔ جاسوسی ناولوں اور کہانیوں میں البتہ قیاسی ماحول سے کام لیا جاتا ہے تاکہ حقیقت بیانی سے کوئی پیچیدگی نہ پیدا ہو۔

"عنبرین" میں طبقہ امراء اور طبقہء غرباء میں پائے جانے والی مختلف خصوصیات کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے متضاد کرداروں کے ذریعے بھرپور نفسیاتی جائزہ لیا گیا ہے اور خصوصاً ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک مشترک خاصیت کو کھوج نکالنے کا اور اسے بہتر طور پر پیش کرنے کا کام بھی کیا ہے۔

امیر النساء نے خواتین میں جو اصلاح چاہتی ہیں اُس کو نسوانی کرداروں کے ذریعے اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے ان کی اصلاحی تجاویز قابلِ قبول ہیں۔ ناول کا پلاٹ بہت خوبصورت ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے۔ جہاں بیانیے کی ضرورت ہے تو اُسی سے کام چلایا ہے اور کہیں مکالمات کو ہی ناگزیر قرار دیا ہے۔ ایک ماہر ناول نگار کی طرح خود کو پیش کرنے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ناول کا افتتاح واضح نہ کر کے اور اختتام کو موہوم چھوڑ کر خود قاری کو نتیجہ اخذ کرنے کی مہلت دی ہے۔ یہ تکنیکی انداز بھی اس ناول کی خوبیوں میں سے ایک ہے۔

بہ حیثیتِ مجموعی ان کی ادبی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرنا بہت بڑی ادبی بددیانتی ہوگی۔ ☆☆☆

راحت محمودہ

ڈاکٹر راحت محمودہ دختر ڈاکٹر یوسف الدین (صدر شعبہء مذہب و ثقافت، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد) ۱۵ رمضان ۱۳۷۶ھ مطابق ۲ اپریل ۱۹۵۷ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم خود آپ کے والدِ محترم (جو اردو، عربی اور فارسی زبانوں کے ماہر تھے) کی نگرانی میں ہوئی۔ آپ نے ایس ایس سی، انٹر اور بی۔اے کے امتحانات میں امتیازی درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۸۲ء میں یم۔اے (فارسی) پاس کیا۔ ۱۹۸۴ء میں یم۔فل حیدر آباد سے اور ۱۹۹۴ء میں پی۔ایچ۔ڈی مدراس یونیورسٹی سے اور پھر ۱۹۹۵ میں انا ملے یونیورسٹی سے بی۔ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ موصوفہ نے ''خانوادہء قاضی بدرالدولہ کی فارسی خدمات'' پر بہ زبان فارسی پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ داخل کیا تھا۔ پی۔ایچ۔ڈی میں کامیابی کے بعد (Islamic Research Academy, S.I.E.T) میں آپ کا تقرر بحیثیتِ اردو لکچرر اور سوپر وائزر عمل میں آیا۔ اس منصب پر آپ تین چار سال فائز رہیں۔ کینسر کے جاں گسل مرض میں مبتلا رہ کر ۱۴۲۱ھ مطابق اکتوبر ۲۰۰۰ء میں انتقال فرمایا اور حضرت عبدالحق مخدوم ساویؒ عرف دستگیر صاحب کی درگاہ (کرشنا پیٹ، مدراس) کے احاطے میں تدفین عمل میں آئی۔ (اسی احاطے میں آج سے آٹھ دس سال پہلے حضرت مولانا باقر آگاہ ویلوریؒ کا مزارِ شریف بھی موجود تھا، لیکن آج اس مقام پر ایک عظیم الشان عمارت ہے۔)

بچپن سے آپ علمی و ادبی ذوق کی لہریں رواں دواں تھیں۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں بھرپور دسترس حاصل تھی۔ کالج کے دور میں یہ شعلہ بیاں مقرر کی حیثیت سے بے حد مشہور تھیں۔ ان کے ہلکے پھلکے مضامین ابتدائی دور میں کالج کے رسائل میں جگہ پاتے تھے۔ روزنامہ '' سیاست'' اور ماہنامہ '' شاداب'' حیدر آباد میں بھی ان کی تخلیقات نمایاں طور پر شائع

ہوئی ہیں۔ اپنے والدِ محترم ڈاکٹر یوسف الدین کی علمی وادبی خدمات پر انہوں نے جو مضامین لکھے وہ "رہنمائے دکن" اور "منصف" حیدر آباد میں چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں موصوفہ نے ڈاکٹر یوسف الدین کے تمام تر مضامین کو ترتیب دے کر کتابی صورت میں منظر عام پر لایا ہے۔ ان مضامین میں موصوف کے علمی، دینی اور ثقافتی، اقتصادی موضوعات پر بڑی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر راحت محمودہ نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کا پہلا حصہ بھی چھاپ دیا تھا لیکن وہ جلد بندی کے مرحلے میں تھا کہ موصوفہ "جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی" کے مصداق ۱۴۲۱ھ مطابق ۲۰۰۰ء سپردِ خاک ہوئیں۔

سنا ہے کہ آپ کے شوہر اعجاز انور صاحب کے پاس ایک اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ "ہند ایران - سفارتی تعلقات" اشاعت کے لئے تیار ہے۔ کاش وہ آپ کے حینِ حیات شائع ہو جاتا۔

مجموعی طور پر راحت کی شخصیت بڑی باغ و بہار تھی۔ ہر لمحہ علمی وادبی طور پر کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ان کا دیرینہ وصف تھا۔

حوالہ

(۱) : یم۔ فل کے فوراً بعد آپ کی شادی ہوگئی اور مستقل طور پر اپنے شوہر کے ساتھ مدراس آگئیں۔

ڈاکٹر ذاکرہ اُمِّ شہلا

ذاکرہ اُمِ شہلا بنتِ محمد یوسف صاحب (مرحوم) بمقام مدراس ۵ فروری ۱۹۵۷ء کو پیدا ہوئیں۔ آپ کا یہ مبارک نام پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی کا عطا کردہ ہے۔ آپ کے والدِ محترم کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر ایک مدت تک بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ اس لئے کہ موصوف کی رہائش گاہ اس دور میں علماء، ادباء، شعراء کی آماجگاہ ہوتی تھی اور ہر شام ایک نئی بہار اور نئی دینی ادبی اور علمی بحث کا آئینہ لئے ان کی چھت پر اترتی تھی۔ جن علماء، ادباء، و شعراء کی نشستوں سے اس گھر کے در و دیوار منور ہوتے تھے اُن میں مولانا ابو الجلال ندوی، پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی، پروفیسر سروش داوٗدی جیسی عظیم المرتب ہستیوں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان عظیم الشان اردو اور فارسی زبان کے اکابرین کے درمیان محمد یوسف صاحب کا علمی و ادبی ذوق پروان چڑھا تھا۔ لیکن موصوف نے کبھی بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کیا۔ راقم الحروف دیکھتا آیا ہے کہ یہی اوصاف موصوف کے تمام لڑکوں مثلاً محمد صلاح الدین برق، محمد معین الدین، اور محمد اقبال اور لڑکیوں میں ڈاکٹر رضیہ بیگم، شاکر بیگم، اور ڈاکٹر ذاکرہ اُمِ شہلا میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ محمد صلاح الدین جو یہاں کے اردو دان طبقے سے بالکل الگ تھلگ اپنی ایک علاحدہ کائنات میں مگن ہیں لیکن ان کے اندر کی تخلیقی ہنر مندی سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر معین الدین زندگی کے سدا بہار جزیرے میں بیٹھے اردو شاعری کے وہ دل آویز نقوش چھوڑ رہے ہیں جن کی کشش انگیز کیفیات سے صرف ان کا اپنا خاندان محظوظ ہو رہا ہے۔ حضرت محمد یوسف صاحب مرحوم نے راقم السطور سے کئی بار کہا تھا کہ معین کی شاعری سنیں لیکن حضرت معین نے کبھی اس حقیر و فقیر کو اس قابل نہیں سمجھا۔ آج بھی برق اور ذاکرہ کی زبانی ان کی شاعری کے چرچے سنے ہیں۔

لگے ہاتھ محمد یوسف مرحوم کے دولت کدے کے دورِ دوم کا ذکر راقم ضروری تصور کرتا ہے۔ یہ دورِ دوم محمد صلاح الدین برق کی اردو ادب سے والہانہ محبتوں سے مزین اور آراستہ ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام اور اس کی علمی وادبی ہنگامہ آرائیاں تاریخ ادبِ اردو میں ایک نا قابلِ فراموش کارنامہ ہیں۔ حضرت عبد مدراسی، حضرت آثم کرنولی، حضرت گلاب مدراسی، حضرت رازامتیاز، حضرت کاوش بدری، حضرت ادیب بھارتی، نورس خیالی، ایس۔ یم۔ حیات، انور ربانی، فرحت کیفی، علیم صبانویدی، کاظم نائطی، اڈوکیٹ محمد فیاض حسین، فخر اعجاز، امیر حسن، محمد اعظم، محمد بذل اللہ، وہاب نازش، کی موجودگی نے اس بزم کو شعروادب کا سرچشمہ بنا دیا تھا۔ ہر ہفتہ افسانوی، شعری اور اردو ادب کے مختلف موضوعات پر مقالاتی محفلیں، وقوع پذیر ہوتیں۔ ان نشستوں کی نوعیت نشستن وبر خواستن کے مصداق نہیں تھی بلکہ ہر افسانے اور مقالے کے اختتام کے بعد چاروں طرف سے سوالات کا گہرا سمندر امنڈ تا تھا اور طوفانی ہواؤں سے ٹکرا جاتا تو گھر کے در و دیوار کہہ اٹھتے :

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

لیکن یہاں راقم صرف یہ شعر کہہ کر

یادِ ماضی عذاب ہے یارب　　　　چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

آگے بڑھنا مناسب سمجھتا ہے......

گویا ذاکرہ امِ شہلا نے شعروادب کے اس ہنگامی ماحول میں ہوش سنبھالا ہے۔ بچپن ہی سے علمی وادبی ذوق کی لہریں ان کے رگ وپے میں رواں دواں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذاکرہ کو ہمیشہ یوسف صاحب ادیبہ پکارتے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حسبِ روایت اپنے ابا اور امی سے حاصل کی۔ ۱۹۷۲ میں ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی، ۱۹۷۳ میں پی۔ یو۔ سی اور ۱۹۷۷ میں بی۔ ایس۔ سی ہوم سائنس میں امتیازی درجے سے کامیابی حاصل کی۔ ہوم سائنس کرنے کے بعد اکثر طلباء اسی (Subject) کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن ذاکرہ نے یہاں روایات سے بغاوت کرتے ہوئے یم۔ اے (اردو) میں داخلہ لے لیا۔ یم۔ اے میں کامیابی کے بعد اچانک حالات اور وقت نے عجیب کروٹ لی اور ذاکرہ ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر معین الدین بی۔ ڈی۔ ایس کے ہمراہ ایک نئی زندگی کے سفر پر گامزن ہوگئیں۔ تقریباً دو سال (۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۲ء) نئی منزل کے دو مسافروں نے لبیا شہر کی پر بہار، دل نشین اور مسرت آگیں فضاؤں میں طمانیت کی سانس لی۔ غالباً

۱۹۸۲ء کے اواخر میں لبیا کو دونوں نے خیر باد کہا اور مدراس میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۴ء تک انہوں نے (Fatima Matriculation School) میں حیثیتِ معلمہ تدریسی فرائض انجام دے۔

۱۹۸۴ء میں اس اسکول سے مستعفی ہو کر ہمہ وقتی ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے مدراس یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی نگرانی میں ' خانوادہء قرنی ویلوری ؒ کی اردو خدمات کے موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی...... جس وقت یہ مقالہ تکمیلی مراحل کو پہنچا تھا، اس مقالے کی ایک ایک سطر اور ایک ایک حرف پر پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب کی نظر پڑ چکی تھی۔ (۱)

جس وقت ذاکرہ ام شہلا اس مقالے کی تحقیق میں منہمک ہوئی تھیں، اُس وقت مدراس اور بیرونِ مدراس ایسی عظیم ترین ہستیاں موجود تھیں جن کے زیرِ سایہ اور جن کی نظرِ عاطفت سے ام شہلا کو کوئی دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ مثلاً مدراس میں مولانا یوسف کوکن کی موجودگی، دیوان صاحب باغ کی منتظمین کی ایک جماعت ڈاکٹر ذاکرہ غوث صاحبہ، جناب ڈاکٹر وحید اشرف اور ڈاکٹر نجم الہدیٰ جیسے بزرگوں کے علاوہ ویلور میں دارالعلوم لطیفیہ کے علماء میں مولانا مولوی بشیر الحق اور سجادہ نشینانِ حضرت مکان، ویلور، وغیرہ سے براہِ راست تعلقات اور مراسم موصوفہ کو حاصل تھے۔ پھر انہیں ایسی کتابیں دستیاب تھیں جن میں خانوادہء قرنیؒ کے ایک ایک فرد کی تاریخ موجود تھی۔ خصوصاً دیوان صاحب باغ کے کتب خانہ محمدی اور امانتی کتب خانہ اور حضرت مکان کے کتب خانے اس عظیم کام کے لئے کافی اور مطمئن کن تھے۔ حضرت مکان میں رہ کر جن بزرگوں نے کام کیا اُن میں مولانا باقر آگاہ ویلوری، عبدالحی واعظ بنگلوری، حضرت مولانا طیب الدین اشرفی، ڈاکٹر حمید اشرف کچھوچھوی، مولانا شاہ محمد قادری، مولانا عبدالرحیم ضیا، مولانا مولوی مرزا سید مصطفیٰ حسین بخاری، مولانا بشیر الحق قریشی کی تحریریں اور تحقیقات کے صفحات آئینہ کی طرح موجود تھے۔

ڈاکٹر ذاکرہ ام شہلا کو تحقیقی مقالے کے لئے تنظیم و تدوین کے اصولوں پر کارگر ہونا تھا اس لئے بھی موصوفہ کو اُن کتابیات اور اشخاص کی طرف رجوع کرنا تھا جو حضرت قرنیؒ ویلوری کے ضمن میں یا اس خانوادہ کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ تاریخی ثبوت پیش کرنے کے قابل تھا۔ بالخصوص آپ نے ڈاکٹر جمیل جالبی، مولوی نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر افضل الدین اقبال، ڈاکٹر سلیمان اطہر

جاوید، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر ظہور الحسن شارب ردولوی، منظور احمد نعمانی، ڈاکٹر سید عابد حسین، شیخ ابو محمد سحر جیسی شخصیات کی تحریروں کی طرف اس لئے رجوع کیا کہ انہیں حضرت قربی ؒ ویلوری کے تعلق سے شاعری، تصوف، معاشرت، نثر نگاری اور اس کے اصول، طریقت و ہدایت کے اسلوب وشعائر پر تمہیدی کلمات کے لئے استفادہ کرنا تھا۔ حضرت قربی ؒ کی شاعری سے متعلق تو موصوفہ کو بہت کچھ کہنا تھا کیونکہ اسی شاعری کے واسطے سے حضرت قربی ؒ اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ حضرت قربی ؒ کی شاعری میں جو مستحسن باتیں تھیں اُن کو اجاگر کرنے میں موصوفہ کو شاعری کی تمام لوازمات پر گہری نظر رکھنی تھی۔

قصیدے اور مثنوی کی اصناف پر توجہ دینا ضروری تھا، صنعتِ تضاد، مراعاۃ النظیر، تشبیہ، استعارہ، کنایہ کے واسطے سے حضرت قربی کے کلام کا فنی جائزہ لیا جاسکتا تھا۔ پھر حضرت قربی ؒ کی منظوم تصانیف پر انتقادی نظر بھی ڈالنی تھی۔ ان تمام مشکل مرحلوں سے امّ شہلا صرف اسی وجہ سے بخوبی گذری ہیں کہ مذکورہ بالا عظیم شخصیات نے اور خصوصاً ڈاکٹر نجم الہدیٰ نے ان کی بھر پور رہبری کی ہے۔ حضرت قربی ؒ پر مقالہ لکھنا کوئی معمول کارنامہ نہ تھا۔ اس ایک شخصیت کے توسط سے پورے خانوادہ ء قربی ؒ کو احاطہ میں لانا تھا۔ اور خانوادہ ء قربی پورے ڈھائی سو سال کے وسیع دور پر محیط تھا۔ حضرت سید شاہ ابو الحسن قربی ؒ سے پیشتر کے بزرگ جو دیگر خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جن سے حضرت قربی ؒ کے خانوادہ کا تعلق تھا اُن میں حضرت سید شاہ رحمت اللہ نائب رسول (جو حضرت قربی ؒ کے پیرو مرشد بھی تھے) حضرت سید علوی بری بیجاپوری، حضرت سید اشرف مکّی، حضرت شاہ سید عبد القادر میراں ولی اللہ، حضرت عبد الحق مخدوم ساوی (عرف دستگیر صاحب) شاہ تراب چشتی ترناملی، حضرت قربی ویلوری، حکیم عثمان سرور امین الدین خان، اسمٰعیل امجدی کے علاوہ اس دور کے مشہور معروف شعراء وغیرہ پر ضمناً ہی سہی اپنے مقالہ میں تذکرہ کرنا لازمی تھا تاکہ کہیں کسی طرح کا خلانہ پیدا ہو جائے اور اس کام سے آسانی سے گذرنا بھی اسی لئے ممکن ہوا جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔

نسب نامہ ء قربی کو بڑے اچھے ڈھنگ سے موصوفہ نے پیش کر دیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے مولانا یوسف کوکن، مولوی باقر آگاہ ویلوری، مولانا سید شاہ محمد قادری اور مولانا رحیم ضیا کی تحریروں سے رسم جوڑا ہے۔ خصوصاً مولانا حضرت طبیب الدین اشرفی مونگیری کے ایک فارسی رسالے کے اردو ترجمہ کو سامنے رکھ کر تصدیق کی ہے جو نسب نامہ وہ پیش کر رہی ہیں، بالکل

صحیح اور قابلِ اعتبار ہے۔ ملفوضات قرلی ویلوری سے بھی کافی مواد حاصل کیا گیا۔ مولانا باقر آگاہ ویلوری کی تصنیف "تحفہ ءاحسن" کے ذریعہ سلسلہ کی بعض شخصیات کا صحیح تعین کیا گیا ہے۔

خود مولانا باقر آگاہ ویلوریؒ کی شخصیت کا احاطہ کرنا بھی ضروری تھا اس لئے ذاکرہ امِ شہلا نے مولوی نصیر الدین ہاشمی، مولانا یوسف کوکن، نواب محمد منور حسین گوہر، ڈاکٹر افضل الدین اقبال وغیرہ کی تحریروں کے علاوہ مدراس کی (Oriental Manuscript Library) کے مخطوطات کی نقلیں حاصل کر کے مواد اکٹھا کیا ہے۔ حضرت قرلی کی تصنیفات کا ایک الگ باب باندھا ہے اور بر سبیلِ تذکرہ انہوں نے حضرت قرلی ویلوری کی تصنیفات کے علاوہ حضرت ذوقی ویلوری، حضرت محوی ویلوری اور حضرت باقر آگاہ کی تصنیفات کا بھی جائزہ لیا ہے۔

خانوادہ ء قرلی کے تعارف اور اس کی خدمات کا اس مقالے میں بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کسی رسالے یا کتاب پر اور صاحبِ کتاب کی علمیت اور اسلوب پر اور مضامین کی نوعیت پر امِ شہلا کا قلم اپنی جولانیاں دکھاتا نظر آتا ہے۔ یہ کام بہت بڑا تھا اور بہت اہم بھی۔ اس کے لئے ام شہلا کو جتنی بھی داد دی جائے وہ کم ہے۔ مقالے کا ایک ایک صفحہ بہت ہی اہم اور معلومات بہم پہنچانے والا ہے۔ عرفانیات اور ادبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک عظیم تحفہ ہے۔ اتنا بڑا کام موصوفہ نے اپنے سر لے کر اپنی ہمت کی داد حاصل کی ہے۔ راقم الحروف کو اس مقالے کے مطالعے کے دوران تھوڑی دیر کے لئے یہ احساس ہوا کہ یہ کام کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک انجمن کا تھا اور یقیناً پی ایچ ڈی کے مقالات پیش کرنے والوں میں سے کوئی بھی یہ زعم نہیں کر سکتا کہ تنِ تنہا وہی اس میدان کا شہ سوار ہے۔

آج کے دور میں کسی معمولی سے شاعر پر بھی لوگ مقالے پیش کر کے سندیں حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔ خانوادہ ء قرلی پر قلم اٹھانا گویا اپنے آرام، اپنی دیگر مصروفیات، مشاغل اور رسم و مراسم کو خیرباد کہہ کر ایک ہی دھن میں ڈٹ جانا ہے۔ موصوفہ نے یقیناً ایسا ہی کیا ہے یا پھر گھر بیٹھے بزرگوں نے یا انہیں مواد فراہم کر دیا یا کسی سے قیمتاً حاصل کر لیا۔ یہ گمان ضرور ابھرتا ہوگا، مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا اور راقم الحروف کو اس بات کا علم ہے کہ خود موصوفہ نے بڑی دوڑ دھوپ کی ہے اور بڑے لمبے لمبے سفر کر کے اور متعدد اشخاص سے مل کر منت و سماجت کر کے مواد حاصل کیا اور بڑی ایمانداری سے اپنے تحقیقی مقالے کو پایہ ءِ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ حضرت قرلی کے بعد ذوقی ویلوری، مولانا باقر آگاہ اور مولانا محوی ویلوری تک پہنچتے پہنچتے زبان و بیان میں جو تغیر و تبدل پیدا ہوا

جس کا عکس ہمیں حضرت شاطرؔ، ایمانؔ، پرتوؔ، شاکرینؔ (علامہ شاکر ناطقی اور شاکر وانم باڑی) کے کلام میں ملتا ہے۔ ان تمام موخرالذکر شعراء کا تعلق حضرت مکان قطب ویلور سے پوری طرح جڑا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس خانوادہ کی برکتیں آج بھی ایک عالم کو مستفیض کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس خانوادے سے عقیدت کی حدوں میں بھی جو تعلق رکھتا ہے وہ سُرخرو ضرور ہوتا ہے۔ شاید یہ اس خانوادے کے بزرگوں کی دعا ہے اور یہ دعا ام شہلا نے بھی لی ہے۔ خدا انہیں اس نیک کام اور نیک تصنیف کا آئندہ بھی اجر دے۔ اس کا اجر تو انہیں بطورِ سند حاصل ہو چکا ہے اور وہ ڈاکٹر کہلانے لگی ہیں۔

☆☆☆

حوالہ

(۱) : محترمہ ڈاکٹر ام شہلا نے راقم کی ایک شخصی ملاقات میں اپنے سوانحی اشارے دیتے ہوئے یہ وعدہ فرمایا کہ بہت جلد وہ اپنا غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ "خانوادہء قربی ویلوری" سے نوازیں گے۔ لیکن تا حال انہوں نے اپنا وعدہ وفا نہیں کیا۔ مقالہ سے متعلق معلومات تشنہ ہی رہ جاتیں اگر مولانا مولوی ڈاکٹر سید عثمان پاشاہ قادری (ناظم، دارالعلوم لطیفیہ، ویلور) اور مولانا مولوی بشیر الحق قریشی صاحب بر وقت از راہِ عنایت مذکورہء بالا مقالہ بھیجنے کی زحمت نہ فرماتے۔ راقم ان دونوں حضرات کا تہِ دل سے مشکور ہے۔

عطیہ کوثر

عطیہ کوثر نے ۱۵ اگست ۱۹۶۲ء کو آمبور (شمالی آرکاٹ) میں کرویکار خاندان کے ایک معزز گھرانے میں جنم لیا۔ آپ کے والد کا نام محمد علی صاحب (مرحوم) ہے۔ ان کا پورا گھرانہ خالص مذہبی صوم و صلوٰۃ اور پردے کا پابند ہے۔ گھر کی چار دیواری میں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ حبیبیہ گرلس ہائیر سکنڈری اسکول سے انہوں نے اورینٹل کے نصاب کے مطابق دینی و دنیاوی تعلیم حاصل کی۔ اس مدرسے میں دو استادوں مولانا محمد علی خالد شاکر نائطی (فرزندِ علامہ شاکر نائطیؒ) اور مولانا عبدالحمید صاحب آلندوری (فرزندِ مولانا عبدالمجید شررؔ آلندوریؒ) سے تفسیر و فقہہ کا درس لیا ہے۔ تعلیم کے دوران ہی بہت سے رسائل اور ناولوں کے مطالعہ کا موقع نصیب ہوا اور طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئی۔ ان کو عفت موہانی، سلمہ کنول اور عادل رشید کی تحریریں بے حد پسند ہیں۔ شاعری کی طرف بھی وہ خود کو ایک حد تک مائل پاتی ہیں۔ کسی کہنہ مشق شاعر یا ادیب کی طرف یہ مائل نہیں ہو پائی ہیں۔ اس لئے شاید ان کی تحریروں میں کسی استاد کی عدم توجہ کی باعث بہت سی فروگذاشتیں دکھائی دیتی ہیں۔ بہت کم عمری ہی میں یعنے جب وہ سترہ سال ہی کی تھیں، ازدواجی زندگی میں بندھ گئیں۔ ۳ جون ۱۹۷۹ء میں کنزام پلی نور اللہ صاحب سے بیاہی گئیں جو ایک تاجر پیشہ نوجوان ہیں۔ ان کے ساتھ تفریحی اور تجارتی سفر میں انہوں نے حیدر آباد، کولاپور، میرج، سانگلی، ہبلی، مہابلیشور، پونہ، ممبئی، کلکتہ، بنگلور، میسور، اوٹی وغیرہ کا دورہ کیا اور خصوصاً بزرگانِ دین کی زیارت گاہوں پر حاضری دینے کا ان کا عقیدہ بہت گہرا اور استوار ہے۔ لکھنے پڑھنے میں جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے اُن کو پورا کرنے کے لئے اُن کے شریکِ حیات پوری طرح تعاون سے کام لیتے اور کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوتے۔ شوہر ہی کی وساطت سے وہ رسائل اور کتابیں خرید تیں۔ دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کی ماں کو ان کی گھریلو مصروفیات اور ذمہ داریوں نے ادبی کتابوں کے مطالعے میں کبھی خلل پڑنے نہیں دیا۔ سفر کے دوران انہوں نے ہندوستان کے

چند اکابرینِ علم و ادب سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا اور اس کو وہ اپنی خوش نصیبی قرار دیتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے افسانے، غزلیں، نثری نظمیں، ادبی خطوط وغیرہ روزنامہ "سیاست" حیدر آباد، روزنامہ "پاسبان" بنگلور، ماہنامہ "قومی محاذ "اورنگ آباد اور ماہنامہ "خوشبو کا سفر "حیدر آباد جیسے جرائد میں جگہ پا چکے ہیں۔ جس کے بارے میں راقم کماحقہٗ واقف ہے۔ ان کی نثری نظمیں، ایک افسانہ بعنوان " انوکھی محبت"(غیر مطبوعہ) اور"میری ڈائری کے چند پیریگراف" کے عنوان کے تحت نو پیریگراف پیش نظر ہیں۔ ان پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے جب دیکھا تو ایک دو جگہ یا تو سہو قلم کے باعث چند خامیاں دکھائی دیں یا پھر یہ سہو قلم ہی نہ ہو یا پھر موصوفہ کو اپنی ان فروگذاشتوں کا احساس نہ ہو۔ مثلاً مذکورہ افسانے میں یہ اچانک خطابیہ ضمیروں کو" تم" سے "آپ" میں اور" آپ" سے " تم" میں بدلتی رہتی ہیں۔ بعض جگہ املاء کی غلطیاں بھی نظر میں آئیں۔ کہیں کہیں تذکیر و تانیث میں ان کو شبہ سا ہے۔ جب یہ چیزیں ہو بہ ہو پریس کو پہنچتی ہوں گی تو ان سے متعلق جو اچھی رائے قائم کرنی ہوتی ہے اس میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ موصوفہ سے اسی لئے یہ گذارش کی جاتی ہے کہ اپنے اندر کی بہترین صلاحیتوں کو سہو قلم کے باعث مشکوک نہ بنائیں۔

ان کی نثری نظمیں ایک طرح کا پکٹوریل(Pictorial) ثابت ہوتی ہیں۔یا جنہیں تصویر نگاری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کے ہاں محبت اور عشق میں کیا فرق ہے ؟ان کی نظم" عشق "کے آغاز کا ملاحظہ کیجئے :

جب محبت کا افسانہ
اپنی انتہا پر پہنچ جاتا ہے
تو وہ عشق بن جاتا ہے

شاید معمولی سی یگانیت کو وہ محبت کا نام دیتی ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو وہ یوں کہہ سکتی تھیں

جب یگانت کا جذبہ
اپنی انتہا پر پہنچ جاتا ہے
تو وہ عشق بن جاتا ہے

اسی نظم میں وہ اس طرح کی چوک بھی کرتی ہیں۔

" وہ اپنے جسم و جان کے تمام تعلق اُسے سونپ دیتی ہے"

" تعلق سونپنا " محاورہ نہیں ہے اور پھر " تمام " کے بعد " تعلق " کہنا بھی غلط ہے۔ جب کہ موقع " تعلقات " کہنے کا تھا۔ اسی طرح کی چھوٹی موٹی سہو کے علاوہ ان کی نثری نظموں میں قابلِ گرفت کوئی اور بات نہیں ہے۔ بعض جگہ پر ان کی روانی پر رشک آتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے لفظ بھی استعمال کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں جو اردو سے تعلق ہی نہیں رکھتے۔ مثلاً " پہچان " نامی نظم میں وہ " منٹ " (Minute) اور (feed) کا استعمال دھڑلے سے کرتی ہیں اور ان کی یہ جرأت بھلی بھی لگتی ہے۔ ان کی یہ پوری نظم قاری کی نذر کی جاتی ہے تا کہ وہ ان کے انداز کو سمجھیں اور اپنے طور پر خود کوئی فیصلہ کرلیں۔

بعض چہروں کو پہچاننے میں
ذرا بھی دیر نہیں لگتی
چاہے اُن سے ہمارا کوئی رشتہ ہو یا نہ ہو
چاہے انہیں ہم آٹھ منٹ بعد دیکھیں یا آٹھ سال بعد
چاہے ہم نے محبت سے دیکھا ہو یا نفرت سے
مگر ایک بار دیکھنے کے بعد
وہ چہرے دماغ میں (feed) ہو جاتے ہیں
پھر دوبارہ کبھی ذہن سے او جھل نہیں ہوتے

ان کی فکر اور قلم کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اگر یہ صحیح راہ پر چلیں تو مستقبل میں یہ رشتہ نئے لکھنے والوں سے ہی نہیں بلکہ اکابرین سے بھی اپنی داد طلب کرے گا۔

ٹمل زبان کی شہرہء آفاق شاعرہ " اوّویار " کی شاعری کے بعض حصوں کا آزاد ترجمہ ماہنامہ " قومی محاذ " اورنگ آباد، مطبوعہ جولائی ۲۰۰۰ء میں پڑھنے کا راقم کو موقعہ ملا۔ ٹمل زبان سے غیر واقف اردو کے فن کاروں کے لئے یہ کام بہت مستحسن ہے۔ علامہ سید عظمت اللہ سرمدی مرحوم، مولانا اسمٰعیل رفیعی اور پروفیسر حسرت سہروردی نے " ترولور " کی عظمت سے واقف کرایا تھا۔ اب عطیہ کوثر نے " اوّویار " کی شخصیت کو اجاگر کرنے کا ذمہ لیا ہے۔

اس طرح کے تراجم کی آج بہت ضرورت ہے۔ اس طرح کے فن کاروں کی ہمت افزائی ہر اردو کے بہی خواہ کی ذمہ داری بھی ٹھہرتی ہے۔ اردو کی عظمت کو دوسری زبانوں میں پیش کرنے کا کام اس سے زیادہ اہم اور قابلِ داد ہے۔ جناب سجاد بخاری نے راقم کے " ہائیکو " کا ٹمل

زبان میں منظوم ترجمہ " بولتی انگلیاں" کے نام سے شائع کر کے ٹمل بولنے والوں اور اردو بولنے والوں کے آپسی مراسم کو خوشگوار بنایا ہے۔ اب موصوف غالبؔ جیسی عظیم ترین شخصیت کی عظمت سے ٹمل والوں کو واقف کرانے کی خاطر غالبؔ کے کلام کا منظوم ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا ہے اور بہت جلد ان کا یہ کارنامہ عالمِ ادب کو چونکا دینے والا ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر حیات افتخار نے " تاریخِ ٹمل ادب " کو اردو زبان میں پیش کیا۔ راقم الحروف نے ٹمل زبان کے مشہور و معروف ناول نگار نا۔پارتھا سارتھی کے ناول(Samudaya Veedhi) کا اردو میں ترجمہ " سماج کی گلیاں" پیش کیا جو ساہتیہ اکاڈمی، دہلی کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۸ء میں منصۂ شہود پر آیا تھا۔ حیاتِ افتخار اور راقم کے تراجم سے اردو والوں کا اتنا ضرور فائدہ ہوا کہ وہ ٹمل زبان کی تاریخ اور ٹمل زبان کی ناول نگاری کی تکنک اور اس کے متنوع ہونے کے ساتھ ساتھ ٹمل زبان کے تہذیبی مسائل سے ضرور آگاہ ہوئے ہیں۔

" میری ڈائری کے چند پیر یگراف "میں عطیہ کوثر چند عام احساسات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے موضوعات انسانیت، سماج، محبت، غم و آلام، خوشی و انبساط مرد اور عورت کے رشتوں وغیرہ کو احاطہ میں لاتے ہیں۔ یہاں وہ ایک مفکر کی حیثیت سے اپنا وجود منوانا چاہتی ہیں۔ جن باتوں کو افسانوں یا شاعری کے ذریعہ بہتر طور پر اجاگر نہیں کر پاتیں تو وہ ان پیر یگراف کا سہارا لیتی ہیں۔ معلوم نہیں قاری ان سے کس قسم کا اثر قبول کرے گا۔ ان کی تحریر میں صفائی تو ہے مگر جمالیاتی برتری ان میں مفقود ہے۔ اگر کوشش کریں تو وہ نثر کی جگہ انہی خیالات کو نثری نظموں میں ڈھال سکتی ہیں۔ کیونکہ نثری نظموں میں انہوں نے اپنے آپ کو بڑی حد تک سنبھال لیا ہے۔

فی الحال ان کے کسی فن پارے پر پوری طرح کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس خودساختگی کے دور میں بھی اپنا ایک نقش چھوڑنے میں کامیاب ہیں۔ ☆☆

منــــــــور رشـــــــید

ٹمل ناڈو کی خواتین افسانہ نگاروں میں چند ایک نام بہت معتبر ہیں جیسے حجاب امتیاز علی تاج، مہر طلعت آمبوری، امیر النساء، عطیہ کوثر آمبوری، فہمیدہ تبسم، نگار سلطانہ جلیلی، ساجدہ زرین، قمر جلیلی، مہناز لطیفی، عرفانہ تزئین شبنم وغیرہ۔ ویسے بعض خواتین نثر نگار اور شعلہ بیان مقررین میں جہاں آراء رب، کشور صفی، سلمہ صلاح الدین، قمر تاج، فاطمہ رئیس، ام ہانی، انجم وغیرہ کے نام بھی کبھی کبھار کہیں دیکھنے اور سننے میں آجاتے ہیں۔ ان خواتین میں منور رشید کے نام کا اضافہ یقیناً ٹمل ناڈو کی آبرو بن کر ابھرا ہے۔

اردو افسانہ نگاری کے میدان میں حجاب امتیاز، مہر طلعت آمبوری اور امیر النساء کے بعد فوراً منور رشید کا نام بہت نمایاں اور روشن ہے۔ ان کا اصلی نام منور سلطانہ ہے۔ انہوں نے 17 جون 1968ء کو حضرت عطار عبدالرشید جیسے وانم باڑی کے ایک عظیم سماجی اور قومی خدمت گذار تاجرِ چرم کے ہاں جنم لیا ہے۔ اپنے والدِ محترم کی وسعت قلبی اور وسیع النظری ہی کے زیرِ سایہ منور رشید کی ذہنی تعمیر و تربیت ہوئی ہے جس کا اظہار موصوفہ نے اپنے ایک نجی مکتوب (مورخہ 22 دسمبر 2000) میں راقم الحروف ہی سے کیا ہے۔ مذکورہ مکتوب ہی میں موصوفہ نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس کو پیش کرنے میں ایک طرح کی ادبی ذمہ داری سے راقم الحروف کو نجات ملتی ہے۔ منور لکھتی ہیں :

" مجھے بچپن ہی سے لکھنے اور پڑھنے کا بے حد شوق تھا، علمی نکات اخذ کرنے اور جذب کرنے کی بے پناہ خواہش تھی۔ میرے ننھیال میں کئی علماء کرام اور مذہبی قائدین گذرے ہیں جن سے اپنی وابستگی کے احساس اور قرب نے علم پروری کے جذبے میں بڑا رول ادا کیا "۔

منور رشید کو شہر وانم باڑی سے بڑی انست ہے جس کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اس ماحول کے ادباء، شعراء، اور علماء سے منور رشید نے بھرپور ذہنی استفادہ کیا ہے۔ جب وہ اسکول میں

زیرِ تعلیم تھیں، تبھی سے انہوں نے افسانہ نگاری کی طرف خود کو مائل پایا۔ نویں جماعت کی طالبہ اور پھر افسانہ نگاری! سوچنے کی بات ہے جب کہ آج کل بڑے بڑے پروفیسروں سے بھی اُردو کا ایک صحیح جملہ لکھا نہیں جاتا۔ میٹرک کی تعلیم کے دوران ہی انہوں نے اپنا اکلوتا ناول " خوددار " مکمل کر لیا تھا۔ اب جب کہ وہ انگریزی میں پوسٹ گریجویٹ ہو چکی ہیں تو یہ اعتراف کرتی ہیں کہ اس ناول میں بہت ساری متضاد باتیں در آئی ہیں، کہتی ہیں :

" ابھی میں اس میدان میں نووارد تھی اور بہت کم سنی میں ہی لکھنا شروع کیا تھا تو مجھے خود اعتراف ہے کہ اس ناول میں اختتام جس انداز سے میں نے کیا ہے وہ شاید بالکل متضاد ہے "۔

آج کوئی ادیب یا فن کار اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ اس سے ان کی صاف بیانی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ناول دہلی کے ماہوار رسالے " گلفام "میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ ناول کا موضوع عام ضرور ہے مگر اس کو پیش کرنے میں ندرت اور تیکھا پن لانے کی موصوفہ نے بھرپور کوشش کی ہے۔ وہ اپنے اس ناول کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں :

" میں نے اس ناول میں ایک فلسفہ بیان کیا ہے وہ یہ کہ عورت کی انا ایک سخت ترین چیز ہے، عورت جب چاہتی ہے ٹوٹ کر چاہتی ہے لیکن جب اس سے بے وفائی کی جاتی ہے تو وہ اپنی انا کی تسکین کے لئے چاہت کو ٹھوکر مار سکتی ہے۔ یہ اس وقت میرا اپنا فلسفہ تھا ضروری نہیں کہ حقیقت بھی یہی ہو" ......

" لیکن چونکہ یہ میرا پہلا ناول تھا اور میرا مشاہدہ یا تجربہ اور مطالعہ بھی اتنا وسیع نہیں تھا۔ اُس وقت میں نے عورت کی انا کے آگے مرد کی محبت اور انکساری کی بھینٹ چڑھا دی۔ قاری کے ذہن میں عورت ظالم اور خود غرض بن کر اُبھرنے لگتی ہے جو بہ یک وقت عورت کی کمزوری پر بھی دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ مغربی سماج میں عورت کی بڑھتی ہوئی انانیت نے ازدواجی زندگیوں کو بے راہ روی کا شکار بنا دیا ہے اور اس بد اعتدالی سے سماج کی بنیادی قدروں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ویسے مغربی سماج میں عورت کو عزت بخشی گئی ہے، اس لئے یہاں اس شدت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں نے اُس وقت اپنے موضوع کی اسی مناسبت سے شاید اپنے ناول کا نام " خوددار " رکھا تھا۔ مگر یہ خوددار نہ ہوتے ہوئے" خود غرض" بن گیا خصوصاً اس وجہ سے کہ میری پہلی کوشش تھی"۔

ناول میں جو کردار ہمیں ملتے ہیں وہ حقیقی زندگی میں ہم سے دوچار ہونے والے کردار ہی ہیں یہ کچھ اجنبی نہیں۔ ناول کا کینوس (Canvas) بہت مختصر ہے اس کی زبان بے حد شستہ اور

سادہ ہے۔ منور رشید کے افسانے ہوں یا یہ ناول بیانیہ اظہار بہت زیادہ ہوتا ہے اور مکالمے بہت کم۔ مگر جہاں مکالمات ہوتے ہیں وہاں مراتب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ سیدھی سادی زبان میں اپنا مدعا بیان کرنے میں بہت ماہر ہیں۔ پروفیسر جلال عرفان صاحب نے منور رشید کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بہت ہی جان دار بات کہی ہے :

"منور رشید کے افسانوں میں بیانیہ کا حصہ زیادہ ہوتا ہے، مکالمات کم ہوتے ہیں، لیکن اکثر مکالمات میں ایسا حکیمانہ انداز ہے کہ قاری چونک اٹھے...... یہی ایک مثال دیکھئے۔ عنبر کہتی ہے : اشعر صاحب! لوگ محبت میں جان دینے کو ٹریجیڈی کہتے ہیں، لیکن میری نظر میں ٹریجیڈی یہ ہے کہ انسان زندہ رہ جائے اور محبت مر جائے"۔

بہر حال ہمیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ جن بنیادوں پر منور رشید کے تعمیری کاموں کا آغاز ہوا ہے، دیکھنے میں وہ بنیادیں کھوکھلی ہیں، مگر یہ بات نہیں ہے۔ یہ بنیادیں اتنی مضبوط ہیں کہ موصوفہ میں اعتماد کی روح پوری طرح سرایت کر گئی اگر وہ اُس وقت پست ہمت ہوتیں تو آج کی منور رشید ہمیں کہیں نظر نہ آتیں۔

اب ہمیں منور رشید کے کم از کم دو افسانوں کا یہاں جائزہ لینا ہے تاکہ مشتے از خروارے کے مصداق ہمیں اُن کی تخلیقی انفرادیت کا پتہ چل سکے۔

"تاج محل اور گھروندہ" یہ ایک مختصر افسانہ ماہنامہ جو "گلفام" نئی دہلی میں جنوری اور فروری 1994ء کے دو شماروں میں دو اقساط میں شائع ہوا ہے۔

اس افسانے کا اختتام قاری کو فوراً خراجِ تحسین ادا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایک عورت بچپن اور لڑکپن میں جس کسی کو بھی اپنا نصفِ ثانی سمجھ لیتی ہے وہ زندگی بھر اس احساس سے چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ یہی اس افسانے کا مرکزی موضوع ہے۔ نیلوفر اور تاجدار قریشی کے درمیان معمولی جان پہچان آگے بڑھ کر ایک دوسرے کے لئے ایک اٹوٹ ملاپ کا احساس بن جاتی ہے۔ مگر کسی ایک کی بے وفائی دوسرے کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ بچپن اور لڑکپن نیلوفر اور تاجدار قریشی کے لئے بہت کچھ تھا۔ مگر جب تاجدار قریشی اپنی اعلیٰ تعلیم کے لئے گاؤں چھوڑ کر شہر چلا جاتا ہے تو اُس کا وہ قول جو کہ وعدہ تھا محض قول بن کر رہ جاتا ہے۔ تاجدار کا یہ قول تھا : "اگر ہمارے جذبے کھرے ہیں، سچے ہیں، تو دیکھنا ہم زندگی کے کسی موڑ پر ضرور مل کر رہیں گے"۔

اس موڑ پر پہنچنے میں پینتیس ۳۵ سال گذر جاتے ہیں اور ان پینتیس سال کے دوران

تاجدار قریشی ایک بار بھی نیلوفر سے نہیں ملتا۔ ماں کی خواہش کے آگے نیلوفر کو مجبوراً ارشاد صاحب سے شادی کے بندھن میں بندھ جانا پڑتا ہے اور وہ اخضر نامی لڑکے کو جنم دیتی ہے۔ اس کے باوجود وہ تاجدار کی یادوں سے رُستگاری حاصل نہیں کرپاتی۔ بے سکون ہونے پر اُسے نیند کی گولیوں کا سہارا لینا پڑتا اور یہ اُس کی زندگی کا ایک متواتر عمل بن کر رہ جاتا۔ خضر جوان ہوتا ہے اور میڈیکل کالج سے تعلیم مکمل کرکے پراکٹس (Practice) کے لئے گاؤں بھی واپس ہوجاتا ہے۔ جب خضر زیرِ تعلیم رہتا ہے تو اُس کی دوری ہمیشہ نیلوفر کو بے چین کرتی رہتی تھی۔ گاؤں پہنچنے کے بعد اچانک اُسے ایران کے فوجی اسپتال میں نوکری کے لئے روانہ ہونا پڑتا ہے تو وہ اپنے اندر تڑپ اٹھتی ہے۔ چھ سال ایران میں پراکٹس کرتے ہوئے خضر کی ایک ہندوستانی خاندان سے رسم وراہ ہوجاتی ہے۔ اسی خاندان کی ایک لڑکی سے وہ شادی کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے، مگر لڑکی والوں کی یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ ایران ہی میں مستقل طور پر سیٹل (Settle) ہوجائے۔ چھٹیوں میں خضر ماں سے ملنے آتا ہے اور ساتھ میں ایک البم بھی لاتا ہے جس میں اُس خاندان کے تمام افراد کی تصویریں موجود ہوتی ہیں۔ نیلوفر اس شرط کو سن کر بہت مایوس ہوجاتی ہے۔ ارشاد کو بھی نیلوفر کی پریشانی سے گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ جب نیلوفر البم دیکھتی ہے تو اُس میں ایک چہرہ وہ بھی ہوتا ہے جو پینتیس سال پہلے ماضی میں دھندلا گیا تھا۔ جس لڑکی سے خضر شادی کرنے والا تھا اس کا نام " نیلم " تھا۔ یہ سن کر نیلوفر کا چہرہ ایک دم پُر سکون ہوجاتا ہے۔ اور وہ کھل اٹھتی ہے۔ارشاد صاحب کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ سب سے زیادہ حیرت اس بات کی ہوتی ہے کہ پینتیس سال کے بعد پہلی بار نیلوفر نیند کی گولیوں کے بغیر پُر سکون نیند کی باہوں میں اپنے آپ کو سونپ دیتی ہے۔ تاجدار کا وہ قول اب دوسرے معنے لئے صحیح ثابت ہوتا ہے۔

" اگر ہمارے جذبے کھرے ہیں، سچے ہیں، تو دیکھنا ہم زندگی کے کسی موڑ پر ضرور مل کر رہیں گے"۔

منور رشید کا دوسرا افسانہ " عید ملن " ہے جو بہت ہی مختصر ہے۔ اور یہ بھی ماہنامہ " گلنام " نئی دہلی کے اگست 1994ء کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے۔

یہ افسانہ کہیں بھی بیانیہ نہیں ہے۔ صرف مکالمات ہی مکالمات ہیں۔ ایک اوسط درجے کے خاندان سے تعلق رکھنے والے میاں بیوی کے درمیان نوک جھونک کا ایک بہترین مُرقع ہے۔ ایک معمولی نوکر اپنی بیوی کی خواہشوں کو پورا کرنے سے ہمیشہ قاصر ہی رہتا ہے۔ یہی بات

اس افسانے کا موضوع ہے۔ مگر تھوڑی سی بھی خوشی کے ساتھ ادنیٰ سی ادنیٰ چیز بھی اگر شوہر بیوی کو پیش کرے تو جو خوشی عورت کو میسّر ہوتی ہے اُس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ عید کے موقع پر بیوی کے لئے لائے ہوئے کپڑے، بچوں کی ضروریات کے علاوہ بیوی کے چند ادنیٰ مطالبات پر شوہر بپھر تا ہے تو یہ ایک عام بات ہی ہے۔ ہر ایک کے تجربے میں ایسی بہت سی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں مگر ان ادنیٰ سی ضروریات کو اچانک شوہر مہیا کر دے تو بیوی کے جذبات ایک حسین کروٹ لینے لگتے ہیں۔ غصے سے باہر جانے والا شوہر شاید گھر لوٹ کر نہ آئے۔ یہ خوف یقیناً ہر نیک بیوی کا ایک شعار ہے۔ یہاں بھی وہی بات ہوتی ہے اور وہ پریشان ہو جاتی ہے اور اپنے مطالبات پر پشیمان ہوتی ہے اور دل ہی دل میں اپنے شوہر کی واپسی کے لئے دعائیں کرتی ہے اور ہوتا بھی وہی ہے۔ یہاں خوشی سے بیوی اور شوہر کا لپٹ جانا کسی عید ملن سے کم نہیں تھا۔

ہندوستان کے سب سے پہلے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو نے کسی موقعہ پر ایک پتے کی بات کہی تھی کہ شادیوں اور تہواروں میں امیروں کی دیکھا دیکھی غریب لوگ بھی شاندار تقریبات منانے میں فضول خرچی کی حد تک خرچ کر کے مقروض بھی ہو جاتے ہیں تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ خرچ کی ہوئی اور قرضے میں لی ہوئی رقم کبھی نہ کبھی کمالی جاسکتی ہے مگر کھوئی ہوئی خوشیاں واپس نہیں لائی جاسکتیں۔ نہرو جی کی یہ حمایت اس افسانے سے جھلکتی ہے۔ غریب شوہر اپنے سفر کے کرایہ کی رقم بیوی کی خوشی کے لئے صرف کر دیتا ہے اور اس کی فرمائشی چیزیں خرید کر گھر لوٹتا ہے۔ اسے اس موقعہ کی خوشی ہی اہم تھی۔ بعد میں آنے والی مشکل کی بالکل پرواہ نہیں تھی۔

منور رشید نے اس افسانے کا نام "عید ملن" جو تجویز کیا، شاید اس سے بہتر کوئی اور عنوان اس افسانے کا ہو ہی نہیں سکتا...... منور رشید کا جمالیاتی احساس اس افسانے میں پوری طرح اجاگر ہے اور ایک عورت ہونے کے ناطے اس افسانے کی واحد نسوانی کردار کے ساتھ انہوں نے پورا انصاف کیا ہے۔ شاید ہر عورت کا جذبہ ایسا ہی ہوگا۔

"پاکیزہ آنچل" دہلی، میں منور کے چند افسانے عالمِ ظہور میں آچکے ہیں۔ ان افسانوں کی تکنک بہت عروج پر ہے۔ آغاز اور انجام کے مابین جو فاصلہ ہونا چاہئے اُس فاصلے کو موضوع کے اعتبار سے وہ پوری طرح برقرار رکھتی ہیں۔ افسانے کو جتنا طویل ہونا چاہئے اتنا ہی وہ طویل ہوتا ہے یا جتنا مختصر ہونا چاہئے، اتنا ہی مختصر ۔ اس گُر سے منور رشید پوری طرح واقف ہو چکی ہیں۔ مستقبل میں ہمیں اُن سے اور بھی بہت سی توقعات ہیں جن کو وہ ضرور پورا کریں گی۔ ☆☆☆

کشور ناز

کشور ناز کی پیدائش ۱۹۷۱ء کو پرنام بٹ (ضلع شمالی آرکاٹ) میں ہوئی۔ ان کے والدِ محترم جناب سہیل راشد شمالی آرکاٹ کے مشہور و معروف نعت گو مانے جاتے ہیں۔ جو ماہنامہ "اذانِ حرم" کے مدیر رہ چکے ہیں۔

کشور کی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول، پرنام بٹ میں ہوئی۔ یہاں سے انہوں نے ایس ایس ایل سی کا امتحان پاس کیا۔ پھر گڑیاتم (شمالی آرکاٹ) کے ایک ہائر سکنڈری اسکول سے بارھویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ ان کے والدِ بزرگوار چونکہ پیشہ کے اعتبار سے مدرس تھے، ان کو بھی اسی پیشے کے لئے گورنمنٹ ہوبارٹ مسلم گرلز ہائیر سکنڈری اسکول فار ٹریننگ، مدراس میں ٹیچرس ٹریننگ میں ڈی۔ ٹی۔ اے کے ڈپلومہ کے لئے داخل کرایا گیا۔ اور انہوں نے اعزازی نمبروں میں یہ امتحان بھی پاس کیا۔ فی الحال وہ آمبور کے ایک ایلمنٹری اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کے شوہر بھی آمبور ہی کے ایک مدرسے میں اردو منشی کے عہدے پر فائز ہیں۔

کشور ناز کو جناب سہیل راشد نے خصوصی طور پر عربی اور اردو کی تعلیم دی ہے۔ بچپن ہی سے اپنے والدِ محترم کی ادبی مصروفیات اور کارگذاریوں کو دیکھتی اور سمجھتی آرہی تھیں۔ ان میں بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ ابتدا میں وہ سبھوں کی طرح تک بندیوں سے کام لینے لگیں۔ اوزان سے ہٹ کر جب وہ شعر کہتیں تو ان کی ہمت افزائی کے طور پر اشعار کی نوک پلک سہیل راشد صاحب خود درست کر دیا دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ صحیح راہ پر گامزن ہو گئیں اور شستہ شعر کہنے لگیں اور ۱۹۹۰ء سے وہ باقاعدگی سے شعر کہنے لگی ہیں۔ ان کی دو ایک شعری تخلیقات "اذانِ حرم" میں جگہ پا گئیں تو ان کی ہمت بندھ گئی۔ انہوں نے ابھی غزل کو اس کے پورے تقاضوں کے ساتھ نہیں

برتا ہے۔ ان کی غزلیں نظموں کے ڈھنگ کی ہوتی ہیں۔ مگر مزاج غزل کا ہی ہے۔ کیونکہ ان میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ملتی ہے اور اشعار کا انسلاک بھی ٹوٹتا ہے۔ ردیف اگر کوئی "اسم" ہو تو غزل نظم کے قریب تر ہو جاتی ہے۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔ اس سے ان کی سہل پسندی، روانی اور ترسیلِ تخیل کی کامیابی کا پتہ چلتا ہے۔

گر کے آنکھوں سے کھو گئے آنسو خاک کا رزق ہو گئے آنسو
زندگی ایک داغ تھی جس کو کس سلیقے سے دھو گئے آنسو
آخرِ شب ڈھلک کے پلکوں سے نرم آنچل میں سو گئے آنسو
گیت بن کر کبھی غزل بن کر دردِ دل میں سمو گئے آنسو

اُن کے دامن کا فیض ہے کشور
دُرِ نایاب ہو گئے آنسو (۱)

"نذرِ اقبال" کے نام سے جو نظم کشور نے کہی ہے اِس سے حیرت ہوتی ہے کہ ایسی قادر الکلامی اچانک ان میں کیسے آگئی جب کہ وہ ابھی اس میدان میں مبتدی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ جناب سہیل راشد کی صحبتوں کا اثر ہے۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں جو "اذانِ حرم" ہی میں ۱۹۹۳ء میں جگہ پا چکی ہے۔

جہانِ شعر و فن کے ماہِ تاباں حضرتِ اقبالؔ بسی ہے روحِ شعر و شاعری میں نکہتِ اقبالؔ
خیالوں کو دئے الفاظ جذبوں کو زباں بخشی یہی تو ہے کمالِ فن یہی ہے حکمتِ اقبالؔ
دیا پیغام قوموں کو محبت کا، اخوت کا دلوں میں تیرتی ہے روشنیٔ سیرتِ اقبالؔ
یہی بانگِ درا، ضربِ کلیم وبالِ جبرائیل ہیں کشورؔ دامنِ شعر و سخن میں دولتِ اقبالؔ

اس کے آخری شعر کے مصرعے اولیٰ میں "جبرئیل" کو "جبرائیل" پڑھیں تو مصرعہ وزن میں آتا ہے۔ مگر "جبرائیل" کہنا غلط ہے۔ اس لئے کہ یہاں خصوصی طور پر علامہ اقبالؔ کے مجموعہء کلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ان کا مجموعہ "بالِ جبرائیل" نہیں ہے۔ دیگر یہ کہ اس شعر میں "یہی" کس کی طرف اشارہ کرتا ہے؟ کیا یہ اس سے پیشتر کے شعر کے لفظ "پیغام" کی طرف تو اشارہ نہیں ہے؟ اگر یہ بات ہے تو پھر آخری شعر کے ساتھ اس کا انسلاک بہت بُعد پیدا کرتا ہے۔ نیز "یہی" کا لفظ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اقبالؔ کی فکر و فن کا سرمایہ محض مذکورہ تین مجموعہ ہائے کلام ہی ہیں۔ آخری مصرعہ بالکل بے معنی اور معلق الفاظ سے

بھرا ہوا ہے۔ اس کی نثر بنانے پر ٹھیک طرح سے نثر نہیں بن پاتی ہے۔ شاید سہیل راشد صاحب نے اپنی نورِ نظر کی اس خامی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بس یہی چاہتے ہوں گے کہ کسی طرح اُن کی ہمت افزائی کی جائے۔

کشور ناز افسانے بھی لکھتی ہیں۔ ان کا ایک افسانہ " جلتا جلتا بجھ گیا " نظر سے گذرا۔ پورا افسانہ پڑھنے کے بعد اس افسانے کا عنوان بالکل ہی بے تکا اور بے معنی لگا۔ خیر عنوان کچھ بھی ہو، افسانے کا موضوع جدت طرازی کا ایک نمونہ ہے۔ انہوں نے اس افسانے میں اُس کردار کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس کا عشق ایک نوجوان سے ہوتا ہے اور اُن دونوں کے عشق کے درمیان حسینہ کی ماں حائل ہوتی ہے اور وہ کسی طرح گوارا نہیں کرتی کہ اُس کے جیٹھ کے لڑکے سے اُس کا عشق ہو اور وہ دونوں ازدواجی زندگی میں بندھیں۔ لڑکے کے ماں باپ پوری طرح اس رشتے کو قبول کر رہے تھے۔ لڑکی کا خون ہوتا ہے وہ بھی بڑی عجیب سچویشن(Situation) میں ہوتا ہے وہ نوجوان اجمل اپنی محبوبہ " اصفیہ " کی یاد میں کھویا ہوا اُس کے نام ایک محبت نامہ لکھ کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے اور اس محبت نامے کو محبوبہ کے حوالے کرنے کے لئے بڑی تیزی سے کار ڈرائیو کرتا ہے اور اچانک یہ کار چار برقعہ پوشوں سے جا ٹکراتی ہے جن میں سے ایک برقعہ پوش بری طرح گھائل خون میں لت پت نیچے گر پڑتی ہے۔ اجمل اس حادثے سے ہوش باختہ ہو جاتا ہے پھر وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہاں جمع شدہ ہجوم کی طرف بڑھتا ہے اور گھائل شدہ لڑکی کو اسپتال لے جانے کے لئے اپنے ہاتھوں میں اٹھاتا ہے تب پتہ چلتا ہے کہ اُس لڑکی میں جان نہیں رہی اور پھر وہ یہ دیکھ کر پوری طرح ٹوٹ جاتا ہے کہ وہ لڑکی کوئی اور نہیں بلکہ اُس کی محبوبہ اصفیہ ہی ہے۔

کہانی کا آغاز روانی کے ساتھ ہوتا ہے اور پوری کہانی بغیر کسی مکالمے کے اختتام کو بھی پہنچ جاتی ہے۔ اگر اس کہانی کو اسٹیج کرایا جائے تو کہانی کو ازسر نو لکھنے میں بڑی دِقت پیش آئے گی۔ مکمل بیانیہ کہانی کو پڑھنے کا راقم کا یہ پہلا اتفاق ہے۔ ایسی تکنک کچھ اچھی بھی نہیں لگتی۔ تاہم اس کو محض تفریحی مطالعے کے خاطر گوارا کر لینا کچھ بے جا نہیں۔

کشور ناز کے اندر موجود تخلیقی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی مشق اور مطالعے کے ذریعے بہترین تخلیقات عالمِ ادب کے آگے پیش کر پائیں گی خصوصاً غزل گوئی میں وہ نکھر سکتی ہیں بشر طیکہ غزل کے مزاج کو وہ اچھی طرح پہچان لیں اور اس کی لوازمات کا پورا پورا خیال رکھیں۔ آج کل کے ادبی رسائل میں مختلف طبقاتِ فکر کے شعراء اور بالخصوص اکابر

شعراء کے کلام کے مطالعے سے انہیں بھر پور فائدہ ہوگا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس اسکول کے سانچے میں ڈھلیں گی۔ روایت ہو، ترقی پسند یا جدت ہو، ان میں گہر پاروں کی کمی نہیں ہے۔ وہ جس سے بھی چاہیں اپنی طبعی اُفتاد کے موافق روشنی اور آب حاصل کر سکتی ہیں۔ اس ضمن میں خود اُن کے والدِ محترم سہیل راشد بھی اُن کے لئے ممدود و معاون ثابت ہوں گے۔ ☆☆☆

حوالہ

(۱) : غزل از: کشور ناز، ماہنامہ "اذانِ حرم" پر نام بٹ صفحہ ۳۰ مطبوعہ ۱۹۹۲ء

مہناز لطیفی

قمر جلیلی کی دختر نیک اختر مہناز لطیفی اس لئے خوش نصیب ہیں کہ اُن کی والدہء محترمہ نے ادبی ڈور کا جو کنارہ چھوڑا تھا اُنہوں نے اُسے تھام لیا ہے اور وہ بھی افسانہ نگاری اور شاعری سے دلچسپی لینے لگی ہیں۔ اپنے والد عبد اللطیف کے نام کی مناسبت سے وہ مہناز لطیفی کہلانے لگیں۔ آج وہ بی۔ یو۔ یم۔ یس کے تیسرے سال کی طالبہ ہیں اور مدراس کی اربیز انا یونانی میڈیکل کالج مدراس میں زیرِ تعلیم ہیں۔ شاید اس تعلیم کے اختتام کے بعد وہ پوری طرح اپنی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر کرنے میں کامیاب ہو پائیں گی۔ ناول نگاروں میں وہ زرینہ آرزو، رُخ چودھری اور نکہت عبد اللہ سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ممکن ہے وہ افسانہ نویسی سے زیادہ ناول نگاری کی طرف مائل ہوں۔ بشر طیکہ ڈاکٹر بننے کے بعد مریضوں کی تشخیص و علاج سے انہیں فرصت ملے اور خانگی زندگی میں اپنی والدہء محترمہ کی طرح بچوں کی تربیت میں غرق ہو کر اپنی صلاحیتوں کو مفقود و پامال نہ کر لیں۔ فی الحال ان کی تخلیقات پر یہاں کوئی بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ مستقبل میں مشیتِ الٰہی سے کوئی ادب نواز اس خدمت پر کمر بند ہو۔ ☆☆

جاویدہ حبیب

جاویدہ مداری ۷ ۲ جولائی ۱۹۷۲ء بمقام مدراس پیدا ہوئیں۔

خوشی کی بات ہے کہ راقم الحروف کے گھر میں بھی ایک ایسا چراغ روشن ہو گیا جو ٹمل ناڈو کی خواتین میں اپنے ڈھنگ سے ایک بہت بڑا مقام نہ سہی کم از کم ایک چھوٹا سا گوشہ ہی بنا لیا ہے جہاں سے مزید پھیلنے کی طرف جرأت مندانہ میلان رکھتی ہیں۔ میں نے اپنی نورِ نظر کو حسبِ استطاعت ایسی تعلیم دینے کی کوشش کی جس کے حصول کے بعد وہ اپنے اندر وہ تمام قابلیتیں پیدا کر سکے جن کا میں متمنی ہوں۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ اگر شاعری کی طرف رجحان نہ سہی، کم از کم ایک اچھی نثر نگار اور محقق بنے اور یہ کہتے ہوئے بھی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اعلیٰ سندوں کے حصول کے دوران جاویدہ کی راہ میں اپنوں کی جانب ہی سے بہت سے کانٹے بچھائے گئے اور جس کے شعلے،...... جو راقم کی حق گوئی (۱) کی باعث پیدا ہوئے تھے ایک ایسی معصوم لڑکی کی طرف لپکنے لگے جس کا کوئی قصور نہ تھا۔ خیر اس حقیقت پر سے وقت ہی اپنا پردہ ہٹائے گا۔ جاویدہ نے گھریلو تعلیم کے آغاز اور اختتام کے بعد مرتضویہ اورینٹل ہائی اسکول سے (O.S.L.C) کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ اس کا رجحان دیکھ کر اُسی کی رضامندی سے بارھویں جماعت کے اسباق کو منتخب کرنے کی چھوٹ دے دی گئی تو جاویدہ نے ہوم سائنس پسند کیا۔ بارھویں جماعت میں ریاستِ ٹمل ناڈو میں وہ درجۂ دوم (State Second) کی طالبہ کا اعزاز پائیں اور اپنے اسکول کے لئے بھی بڑی باعثِ فخر ثابت ہوئیں جہاں سے کسی طالبہ نے اتنے اعزازی نمبروں سے آج تک کامیابی حاصل نہیں کی۔ بارھویں جماعت کے بعد وہ بی۔اے (اقتصادیات) کی طالبہ ہوئیں اور (S.I.E.T) سے (۱۹۹۳ء میں) بی۔اے کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ چونکہ گھر میں کتابوں اور رسائل کی دیکھ بھال اور انتظام وانصرام جاویدہ ہی کے حوالے تھا اس لئے فرصت کے اوقات میں وہ چپکے چپکے ان کا مطالعہ کرتی رہیں۔ اس کا پتہ راقم کو اس وقت ہوا جب کہ ایک شام کسی

موضوع پر دوستوں کے درمیان بحث میں جاویدہ نے مداخلت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
دوستوں نے مشورہ بھی دیا کہ جاویدہ کو وہی بننا ہے جو اس کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لئے موزوں
ہو۔ غرض جاویدہ نے اردو اور عربی میں یم۔اے کی سندیں بھی حاصل کر کے اپنی پوشیدہ
صلاحیتوں کا اعلان کیا۔ ان دونوں اسناد کے ہوتے ہوئے آسانی تھی کہ وہ اپنی تحقیقی لگن کو تسکین
پہنچانے کے لئے یم۔ فل ور پی۔ ایچ۔ ڈی کی طرف رجوع ہوں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ یم۔ فل تو
انہوں نے مدراس یونیورسٹی سے کر لیا۔ حاسدانہ ماحول میں رہتے ہوئے اسی یونیورسٹی سے
پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا غیر مناسب سمجھ کر وہ دوسری یونیورسٹی کی طرف مائل ہوئیں اور ایک تحقیقی مقالہ
بھی داخل کرادیا۔ امید ہے کہ وہ اپنے مقصد میں مستقبل قریب میں ضرور کامیاب ہوں گی۔
راقم کی بعض غیر مطبوعہ تحریریں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں تو انہیں جاویدہ نے یکجا کیا
اور مصُر ہوئیں کہ انہیں ان کی تالیف کی اجازت دی جائے۔ اس کام میں جاویدہ نے سارا مصرف
خود برداشت کرنے کا وعدہ کیا کیونکہ وہ ایک خوشحال خاندان کی بہو بن چکی تھیں اور ان کے خاوندِ
عزیزی حبیب اللہ سلمہٗ، جاویدہ کی ہر پسند اور ناپسند کا خیال رکھتے تھے۔ خوشی حبیب اللہ نے جاویدہ
کی تحریک کو عملی جامہ پہنانے کی رضامندی ظاہر کر دی، جس کے نتیجے میں راقم کی دو تصنیفات
"ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب" اور "متاعِ شعر وادب" کی وہ مولفہ بنیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ
جو کچھ بھی تحریر کرتیں تبرک تصور کرتے ہوئے مجھ سے نظرِ اصلاح کی درخواست کرتیں۔ اُن کی
تحریریں روانی اور سلاست کی حامی ہیں، اس لئے ناچیز کو اُن کی اصلاح میں زیادہ دِقت پیش نہیں
آئی۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ جاویدہ اپنی کسی تحریر پر کی گئی اصلاح پر بھی نکتہ چینی کرنے لگتیں اور اپنی
تحریر کو بہتر قرار دینے لگتیں۔ اِس خود اعتمادی سے مجھے خوشی بھی ہوتی اور میں جاویدہ کو اُن کی رو پر
بہنے کے لئے چھوڑ دیتا۔ اُن کے مقدمے، انتساب وہدیہ ءتشکر وغیرہ میں جس ڈھنگ کی نثر ملتی
ہے اُس میں راقم کی نثر کی جھلکیاں ضرور پائی جاتی ہیں، کیونکہ راقم کی تحریر پڑھتے پڑھتے ان پر بھی
ویسی ہی نثر کا رنگ جمتا چلا گیا ہے۔(۲)
جاویدہ حبیب میرے بہترین دوستوں میں سے خصوصاً مولانا راہی فدائی، ڈاکٹر ناز
قادری، جناب کاظم نائطی، ڈاکٹر محمد علی اثر اور مولوی یعقوب اسلم سے اس قدر گھل مل گئی ہیں کہ
انہیں حقیقی چچا کا درجہ دیتی ہیں اور راقم سے زیادہ ان مخلص احباب سے اپنی تحریروں کے بارے میں
مشورے لیتی ہیں اور وہ ان کی کُھل کر ہمت افزائی کرتے ہیں۔

راقم کے خیال میں جاویدہ کا اٹھنا بیٹھنا کسی ادبی ماحول میں نہیں ہوا ہے۔ سوائے مذکورہ بالا ایک دو دوستوں کے، مگر رسائل اور کتابیں ہی ان کی ادبی محفلیں ہیں جہاں وہ پوری اردو دنیا سے گھل مل جاتی ہیں اور نتیجہ میں اپنی فکری پرواز کی داد پاتی ہیں۔ ایک موقع پر کاظم نائطی نے جاویدہ کو رائے دی تھی کہ وہ شاعری کی طرف بھی رجوع ہوں تو ہنس کر جاویدہ نے بات ٹال دی تھی۔ جس کا ذکر کاظم نائطی نے مجھ سے کیا۔ میں نے بھی کوئی جواب نہیں دیا اور یہ سوچتا رہ گیا کہ ہو سکتا ہے کسی شام جاویدہ کوئی منظوم تخلیق اسی طرح پیش کریں گی جس طرح انہوں نے اپنی ادبی دلچسپی کا اظہار اچانک کیا تھا۔

آج کل جاویدہ اپنے شوہر کے ساتھ خوشی خوشی زندگی بسر کر رہی ہیں، مگر ان کی ادبی پیاس انہیں ہر شام ناچیز کے غریب خانے کی طرف کھینچ کر لاتی ہے۔ ابھی وہ کمسن ہیں اور بہت سے تجربات سے گذری نہیں ہیں، مگر اُن کے اندر کی جیالی عورت سے امید ہے کہ وہ مستقبل میں اپنا کوئی نقش ضرور چھوڑیں گی۔ ہر باپ کی طرح میں بھی اُن کے اسی شاندار مستقبل کی تمنا کرتا ہوں۔

جاویدہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی چہیتی دختر ہیں، جہاں اپنے شوہر کے لئے ایک وفادار رفیقِ حیات ہیں، وہیں وہ اپنے چچاؤں اور چاچیوں کی بھی نورِ نظر ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ اپنے رشتے کے بھائیوں اور بہنوں کے لئے ایک مثال قائم کرتی جا رہی ہیں۔ ☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : حق کو ہر دور میں کم ظرف لوگوں نے سولی پر چڑھایا ہے

(۲) : مذکورہ بالا دو تصنیفات کے علاوہ جاویدہ حبیب مزید دو کتابوں "نورِ اعظمؐ" (راقم کی نعتوں کا مجموعہ) اور خواتینِ تمل ناڈو کی دینی، علمی وادبی خدمات" (راقم کا تازہ ترین تحقیقی مقالہ) کی تالیف کی ذمہ داری بھی اپنے سر خوشی لے لی ہے۔

ساجدہ زرین

ساجدہ زرین کا اصلی نام ساجدہ تبسم ہے۔ آپ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۳ء کو وانم باڑی میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والدِ محترم والے عبداللہ صاحب، تاجرِ چرم ہیں جو ایک طویل مدت تک بغرضِ تجارت ممبئی میں رہ چکے ہیں۔

ساجدہ زرین نے اپنی ابتدائی تعلیم مدرسہ نسوان وانم باڑی میں حاصل کی۔ پھر اسلامیہ گرلس ہائیر سکنڈری اسکول سے بارھویں جماعت پاس کر کے مدراس یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ ان کے والد ہی کی بدولت ان کو اردو سے اُنس پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے وہ کہانیوں میں دلچسپی لینے لگیں۔ اسکول کے قریب واقع لائبریری سے کتابیں لا کر پڑھنے کے بعد اُن کا رجحان ادبی رسائل مثلاً بیسویں صدی، بانو، پاکیزہ آنچل، مشرقی آنچل، مشرقی دلہن، نور اور ہتول کے مطالعے سے کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ شوق کاغذ کے پرزوں پر کہانیاں لکھ کر محفوظ کر لینے کی حد تک رہا۔ کسی ادبی جریدے کو اشاعت کے لئے روانہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بڑی ہمت کر کے ایک افسانہ "انجان گلابوں کی بہار" بغرضِ اشاعت ماہنامہ "پاکیزہ آنچل" دہلی کے لئے روانہ کیا اور جب وہ طبع ہوا تو ان کا اعتماد بڑھ گیا۔

وہ شاعری سے صرف پڑھنے کی حد تک دلچسپی رکھتی ہیں۔ حیرت ہے کہ انہیں پروین، شاکر اور ابنِ انشاء جیسے شاعر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ روایت پسندوں میں وہ کسی کی طرف زیادہ مائل نہیں ہوئیں۔ البتہ علامہ اقبال کی شاعری میں وہ اپنے لئے جاذبیت محسوس کرتی ہیں۔ ناول نگاروں میں وہ بشریٰ رحمٰن، رضیہ بٹ، قرۃ العین حیدر اور فریدہ اشفاق سے متاثر ہوئی ہیں۔

آج کل وہ اپنے شوہر کے ساتھ "قطر" میں مقیم ہیں۔ ممکن ہے وہاں کے ہندوپاک کے قلم کاروں سے ان کے روابط ہوں اور وہ کچھ نہ کچھ لکھتی پڑھتی ہوں، کیونکہ ان کے اندر ایک باعزم فن کار ابھی زندہ و تابندہ ہے۔ ☆☆☆

عرفانہ تزئین شبنم

عرفانہ تزئین شبنم (پیدائش بمقام وانم باڑی ۱۹ جولائی س۷ ۱۹ ء) کا تعلق ٹمل ناڈو کے اردو پرور شہر وانم باڑی سے ہے اور ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ ٹمل ناڈو کی خواتین اب ہمت اور خوش کے ساتھ بروئے کار ہیں اور ایک قدیم روایت کو پھر سے زندہ کر رہی ہیں کہ اس علاقے کی خواتین ابھی زندہ اور متحرک ہیں۔ آپ کے والدِ محترم جناب فضل الرحمٰن صاحب نے عرفانہ کی ابتدائی تعلیم اسلامیہ گرلز ہائیر سکنڈری اسکول، وانم باڑی میں دلائی۔ موصوفہ نے پھر ادیبِ ماہر اور ادیبِ کامل (علیگڈھ یونیورسٹی) کی سندیں حاصل کی ہیں۔ آج کل آپ اسی اسکول میں بحیثیتِ اردو منشی بر سر روزگار ہیں۔ آپ کے افسانے بتول (رامپور)، مشرقی آنچل (دہلی)، پیش رفت (دہلی)، بیسویں صدی (دہلی)، پندرھویں صدی (دہلی)، پیامِ اردو (حیدر آباد) وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب تک وہ تقریباً ۲۳ افسانے تحریر کر چکی ہیں۔ بیرونِ ہند کے ادبی جرائد میں بھی ان کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ وہ " جانِ عالم " نامی ایک ناول بھی تحریر کر چکی ہیں جو بیسویں صدی میں قسط وار چھپ چکا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے شاعری کی طرف بھی مائل ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عرفانہ تزئین شبنم کی ذہنی تربیت اور فنی نکات کی شناخت کرانے کے لئے یا تو کوئی آمادہ نہیں تھا یا خود موصوفہ اس کو پسند نہیں فرما رہی ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعہ " جائے پناہ "(مطبوعہ ۱۹۹۹) میں کہیں کہیں انتقادی ذہن رکھنے والے قاری کا ذہن کوفت محسوس کرتا ہے۔ مثلاً کتاب کے کھولتے ہی " انتساب "میں موصوف نے " آغوش " کو تانیث قرار دیا ہے۔ خود " جائے پناہ " میں ذم کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ اس کے عوض" پناہ گاہ " میں یہ بات نہیں ہوتی۔ دیگر یہ کہ اس کا آخری افسانہ " جائے پناہ "ایک منی ناول معلوم ہوتا ہے۔ ایسی طوالت نا قابلِ برداشت ہے۔ ان تمام

باتوں کے علاوہ ان کی زبان پر ٹمل کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے۔ وہ اردو افسانے کی ترویج اور موجودہ افسانے کی تکنیک سے واقف ضرور ہوں گی۔ مگر خود اپنے افسانوں کو وہ بیانیہ اور متواتر آگے بڑھنے والے واقعات کا اظہار یہ بنا دیا ہے۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات نئے تو نہیں مگر ان کے کرداروں کو برسرِ کار بنانے میں نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں مختار بدری کرشنگری کا پیش لفظ تعارف بھی ہے اور تبصرہ بھی، مگر موصوف نے اپنے قلم کو زیادہ تحسین یا تزئین سے باز ہی رکھا ہے۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ " وقار " تین اہم کرداروں فہد، شبّی، اور نشی پر بنائی گئی ایک کہانی ہے جس کے اطراف ذیلی کردار بلبلوں کی طرح بنتے پھوٹتے جاتے ہیں۔ کہانی کا عنوان " وقار " اس وقت کھلتا ہے جب کہانی دم توڑنے لگتی ہے۔ فہد کا بہت زیادہ مہذب ہونے کا احساس ہی اس کو بے مروت بناتا ہے اور خود کے اپنے اسٹیٹس (Status) کو سنبھال رکھنا " وقار " ہے۔ کہانی اچھی ہے اور دلچسپ بھی۔ افسانہ نگار کہانی گوئی میں یہاں کچھ سائنٹفک بننے کی کوشش کرتی ہیں اور ایک حد تک کامیابی کی حدوں کے قریب پہنچ رہی ہیں۔ کہانی کا بوڑھا " برگد " اچھی علامت ہے۔ حالات کے شکار افراد کی تبدیلیوں کی طرح برگد بھی تبدیلیوں کا شکار ہو سکتا تھا مگر نہیں۔ وہ اب بھی شبی اور نشی کا قدیم دوست ہے۔ فہد کی طرح طوطا چشمی سے کام نہیں لیتا۔ شبی اپنے دوست فہد سے مل کر جب ٹوٹ جاتا ہے تو وہ اسی برگد کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہاں " برگد " کا " وقار " پوری طرح قائم ہے۔

" کرب " ایک مریضہ کی کہانی ہے جو فالج زدہ ہے۔ اس کی زبانِ حال ہی اس کہانی کی نیریٹر ہے۔ ورنہ ایک مفلوج مریضہ جو صرف دیکھ سکتی ہے، سن سکتی ہے، مگر بول نہیں سکتی، حرکت نہیں کر سکتی، اپنے " بیڈ " کے آس پاس کے واقعات اور حالات کا تذکرہ کیسے کر سکتی ہے۔ اس کہانی کی یہ خامی شروع سے آخر تک کھلتی ہے۔ اسی لئے اوپر کہا کہ مریضہ کی زبانِ حال ہی کہانی نیریٹ کر رہی ہے۔ موضوع بہت خوبصورت ہے۔ قاری دلچسپی کے ساتھ کہانی ختم کرنے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔

" ذرا سی زندگی " اس مجموعہ کی بہت اچھی کہانی ہے۔ کینسر کی مریضہ ناجیہ کی ذہنی پریشانیوں اور غم واندوہ کو اجاگر کرتا ہے۔ اس کے زیرِ اثر اس کا شوہر شاہزاد بھی موت کی تلخیوں کی طرح ہی زندگی کو بھی گھونٹ گھونٹ پی رہا ہے۔ ناجیہ چاہتی ہے کہ اس کی موت کے بعد شاہزاد کسی

اور کا ہر گز نہ بنے اور ہمیشہ اس کا نام لیوا رہے اور اس سے اس کا وعدہ بھی لے لیتی ہے۔ مگر کینسر کی ایک اور مریضہ " شیما " اس کی سوچوں کی کایا پلٹ دیتی ہے اور اپنی ذراسی زندگی کا اطمینان حاصل کر کے دم توڑ دینے کی متمنی ہوتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کو اس وعدے کے چنگل سے آزاد بھی کرا دیتی ہے۔ افسانہ بڑی صفائی اور خوبصورتی سے آگے بڑھتا ہے اور اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں وہ بہت کم ہی محتاط قاری کے ذہن میں ناگواری کے جھٹکے لگاتی ہیں۔

" موتیوں والے موسم " میں افسانہ نگار نے بتایا ہے کہ ایک زندگی کے خاتمے پر کتنی ساری زندگیاں خالی اور کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ نو بہار کی موت ضماد حسن میں وقتی خلا تو پیدا کر دیتی ہے۔ مگر نو بہار کی بہن دلناز اور بیٹی روحی کو بھی پوری طرح جھنجھوڑ دیتی ہے۔ کہانی میں خواہ مخواہ واقعات کو خلط ملط کر کے تقدیم و تاخیر کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔ یہ کہانی قاری کو ذہنی ورزش میں مبتلا کرتی ہے اور اسی کے باعث کہانی زیادہ قابلِ قبول ثابت نہیں ہوتی۔ اس کہانی میں کچھ عجیب قسم کے نام عون، ضماد وغیرہ بھی قاری کو افسانہ نگار کی جدت پسندی کی کوشش کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی نہیں، اس مجموعے کے دیگر افسانوں میں بھی ایسی ہی بات دکھائی دیتی ہے۔

" زرد پتوں کا ہجوم " ایک اوسط گھرانے کی کہانی ہے جس میں کئی افراد کے حسین خواب ٹوٹتے بکھرتے رہتے ہیں۔ بیمار عورت کے باعث گھر کی تین لڑکیوں، ایک لڑکے اور شہر کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کی مشکلیں ایک عام المیہ ء زندگی ہی ہیں مگر اس المیہ میں جذبات کا ٹوٹنا کچھ عجیب سا احساس پیدا کرتا ہے۔ صہیب ایک ڈاکٹر بننے کے خواب پورا نہیں کر سکتا۔ روشی اور حسنین کی محبت میں دراڑیں پڑتی ہیں۔ موسم ہی گرم اور جھلسا دینے والا نہیں ہے۔ حالات بھی ویسے ہی ہیں۔ اس کہانی میں سبھی ٹوٹتے اور بکھرتے ہیں۔ روشی، حسنین کی جگہ سکندر علی کی بیوی بن جانے پر مجبور ہے صرف اس لئے کہ ماں کا علاج ہو، صہیب ڈاکٹر بن سکے۔ عاشی اور نشی کی تعلیمی ضروریات پوری ہوں اور سب سے زیادہ بوڑھے لاچار باپ کا چڑچڑا پن ختم ہو۔ " کسی کا اطمینان ہی دوسرے کی بے اطمینانی " کا فلسفہ دہرا گیا ہے اور اس کو سنبھالا دینے کی عرفانہ تزئین کی کوشش سراہی جا سکتی ہے۔

اس مجموعے کی آخری کہانی " جائے پناہ " کئی اعتبار سے ایک اچھی اور دلچسپ کہانی ہے۔ کہانی کا مقصد کہانی کے کردار منیب آفندی کی ایک افتتاحی تقریر سے بیان کیا گیا ہے۔

" انسان چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، پہلے انسانیت کے رشتے سے پہچانا جاتا ہے۔

یہ پہچان کا رشتہ...... یہی رشتہ سب سے بڑا ہے۔ سب سے افضل، ایک انسان کا دوسرے انسان تک پہنچنے کا زینہ۔ یہ بیچ کے تمام فاصلے تو محض تصنع ہیں جس کا کائی وجود ہی نہیں ہوتا۔ اپنے اطراف فاصلوں کا جال بننے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس رشتے کے معیار تک نہیں پہنچ پاتے...... "۔ کہانی کے کرداروں میں اہم ترین پانچ کردار ہیں۔ شبناز احمد، اس کی ماں، اس کے باپ احمد شاہ اور منیب آفندی۔ شبناز احمد کی ماں ہی شبناز احمد اور منیب آفندی کے درمیان فاصلوں کا جال بُنتی ہے اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ شبناز کے باپ نے منیب آفندی کو اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں شبناز احمد کے لئے چن لیتا ہے اور دونوں کا بیاہ ہو جاتا ہے۔ ماں کی نظر میں اس کے بھائی کا لڑکا احمد شاہ اس کے لئے موزوں تھا۔ دولت کے نشے میں چور ماں منیب کو کسی قابل نہیں سمجھتی اور موقعہ ملنے پر اپنی بیٹی کے ذہن میں زہر بھر کر اس کو اپنے شوہر سے جدا کر لیتی ہے اور پھر اسے احمد شاہ کے قریب کرانے کے تانے بانے بنتی ہے۔ احمد شاہ کے شادی شدہ ہونے کی بات کہانی کے اختتام پر قاری پر کھلتی ہے۔ اپنے شوہر یعنی شبناز احمد کے باپ کی وفات پر اس کا سارا کاروبار ٹوٹ جاتا ہے اور پھر رہی سہی ساری امارت ختم ہو جاتی ہے۔ اس موقعہ پر منیب آفندی کی مڈبھیڑ کہانی کو اختتام پر لاتی ہے اور اس کے تصنع کا وجود چکنا چور ہو جاتا ہے۔ کہانی خوشی اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اس کہانی میں ایک خامی یہ ہے کہ اچانک کہانی آپ بیتی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور شبناز احمد دو تہائی کہانی میں " تم " کے مخاطب کی ضمیر سے منیب آفندی کو خطاب کرتے ہوئے حالات بیان کرتی جاتی ہے۔ اچانک یہ تبدیلی بہت کھلتی ہے۔ شروع اور اختتام پر آپ بیتی کا ڈھنگ نہیں تھا۔ اس خامی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہم مجبور ہیں ورنہ کہانی کی دلچسپی اس خامی پر پردہ ڈالے رہتی۔

کاش عرفانہ تزئین شبنم کہانیوں کی اشاعت سے پیشتر کسی "محسن" سے مدد لیتیں۔ کیا ان کے ماحول میں ایسا کوئی محسن نہیں تھا؟ ☆☆☆

فہمیدہ فارحہ تبسم

فہمیدہ تبسم (دختر والے عبداللہ) ۳۰ ستمبر ۱۹۷۵ء کو وانم باڑی میں پیدا ہوئیں اور ان کی ابتدائی تعلیم یہیں مدرسہء نسوان میں ہوئی۔ پھر انہوں نے اسلامیہ گرلز ہائیر سکنڈری اسکول سے 2+ کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۹۴ء میں مدراس سے ٹیچرس ٹریننگ کا ڈپلوما حاصل کیا۔ خوش نصیبی سے انہیں فوراً ۱۹۹۵ء میں پیشہء تدریس حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ بعد میں وہ نجی طور پر مدراس یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد ایم۔اے (انگریزی) کی سند سے فیض یاب ہوئیں۔ آج کل وہ اسی پیشے میں منہمک ہیں۔ افسانہ نگاری کی طرف ان کو مائل کرنے میں ان کی اماں جی (نانی) کا بہت دخل تھا۔ مقامی لائبریری سے بچوں کی کتابیں پڑھنے کا شروع سے ہی شوق تھا اور یہ شوق بڑھتا ہی گیا۔ کتابوں اور رسائل میں افسانوں اور ناولوں کے مطالعے سے ان کے ذہن میں کہانیوں کے خاکے بنتے بگڑتے رہے۔ ان کی بڑی بہن ساجدہ زرین کا ایک افسانہ ''پاکیزہ آنچل'' دہلی، میں جب شائع ہوا تو فہمیدہ تبسم کو بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ کہانیاں لکھ کر ان کی اشاعت کرا کے پذیرائی حاصل کریں گی۔ غرض انہوں نے ذہن میں کلبلاتے افسانوی خاکوں کو کاغذ پر اتارنے کا کام شروع کیا۔ انہوں نے اپنے لئے ایک قلمی نام بھی تجویز کر لیا اور خود کو فہمیدہ فارحہ تبسم سے موسوم کیا۔ ان کی پہلی کہانی '' غرور کا انجام ''بچوں کے ماہنامہ '' ہلال ''میں نومبر ۱۹۸۹ء ، میں شائع ہوئی۔ پھر فوراً ہی انہوں نے ایک اور کہانی '' شرارت ''اسی ماہنامہ کو ارسال کی اور اس کی بھی اشاعت دیکھ کر ان کی ہمت بندھ گئی۔ یہ ماہ نامہ بچوں کا تھا۔ اس سے وہ کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھیں۔ انہوں نے پہلا افسانہ ' رہگذر پیار کی 'ماہنامہ ' مشرقی آنچل ' کو بغرض اشاعت روانہ کیا اور وہ مارچ ۱۹۹۱ء میں شائع ہو گیا۔ اب وہ باقاعدگی سے '' مشرقی آنچل'' یا '' مشرقی دلہن'' دہلی میں خود کو افسانوں کے ذریعے اجاگر کرنے لگیں۔ '' تجدیدِ وفا''،

"خلش کی جدائی"، "میری ذات ذرہ ء بے نشاں" وغیرہ 'مشرقی آنچل' و 'مشرقی دلہن' میں شائع ہوئے۔ ان ماہناموں کے مدیرین جناب عرفان صاحب اور محترمہ زرینہ صاحبہ دونوں سے فہمیدہ کی خط و کتابت جاری ہو گئی یہاں تک کہ دونوں طرف کے خاندانی رسم و رواج اور اس کے افراد سے بھی واقفیت گہری ہوتی چلی گئی ہے۔ شاعری کی طرف بھی یہ مائل ہوئی ہیں مگر اس نازک فن میں وہ بغیر کسی کہنہ مشق استاد کے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ اس لئے کہ نجی طور پر اس فن کی خصوصیات کو سمیٹنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ البتہ ان کے اندر کے فن کار کے زندہ ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ وہ اپنے طور پر غزلوں اور نظموں کے کہنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔ ان کی شاعری ابھی کسی طرح کا تاثر قائم کرنے کے قابل نہیں ہے۔ نثری نظمیں البتہ قابلِ قبول اس لئے ہیں کہ ان میں آہنگ و عروض محض ذہنی ترنگ کا نتیجہ ہیں۔ اصولاً نہیں۔

افسانے ہوں یا کہانیاں یا شاعری فہمیدہ فارحہ تبسم ابھی خود ساختگی کے دور سے گذر رہی ہیں۔ موصوفہ صاف بیانی میں ایک حد تک ملکہ پیدا کر چکی ہیں۔ محاوراتی زبان سے گریز کرتے ہوئے اپنے ڈھنگ سے وہ الفاظ کی نشست کا خیال رکھتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات بہت ہی ہلکے پھلکے اور قدامت پسند اسلامی معاشرے کے احساسات، خیالات، طور طریقوں اور رسم و رواج کے دائرے میں ہوتے ہیں۔ کہانی کا موضوع دو ایک کردار کے اطراف گھوم پھر کر فوراً اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار ترسیل کے مرحلے جس طرح خود پار کرتی ہیں اُسی طرح نتیجہ خیزی کا کام قاری پر نہ چھوڑ کر خود نتیجے بیان کر دیتی ہیں۔ ہلکے پھلکے محبت کے افسانے کسی سماجی گتھیوں کو سلجھاتے نہیں ہیں۔ مگر کہیں کہیں وہ سماج کی ادنیٰ سی خامی یا برائی کو ذہن میں رکھ کر ایک دو باتیں کہہ جاتی ہیں۔ مثلاً "تجدید وفا" میں شوہر کی اہمیت نہ جاننے والی بیوی کا انجام اور پھر اس اہمیت کو پہچاننے کے بعد اپنی خطا کا خمیازہ بھگتنا ہلکے پھلکے موضوع کے ذریعہ ظاہر کیا ہے۔ یہی بات اُن کے ایک اور افسانے "خلش جدائی کی" میں دکھائی دیتی ہے۔ سادات سے تعلق رکھنے والے گھرانے کا زعم کہ کسی اور خاندان مثلاً شیخ، پٹھان، یا لبّے سے لڑکی نہ بیاہنا ایک سماجی برائی قرار دیا ہے اس ایک برائی کو اجاگر کرنے کے لئے ایک موضوع ڈھالا گیا اور بڑی سرعت سے افسانہ شروع کر کے ختم بھی کر دیا۔ البتہ ان کے دو ایک افسانے کچھ تجربوں کے بعد تخلیق پذیر افسانے دکھائی دیتے ہیں، مثلاً "انجان گلابوں کی بہار" اور "میری ذات ذرہ ء بے نشان"۔

"انجان گلابوں کی بہار" میں نقشبہ جیسی ایک شریر لڑکی جسے صرف جامن کھانے کا

شوق ہوتا ہے وہ کسی نوجوان لڑکے کی طرف ذرا بھی مائل نہیں ہوتی اور محبت نام کی کوئی بات اس کی سمجھ سے بعید ہے۔ اس کی جامن کھانے کی سادگی ہی اس افسانے کے ہیرو عرشاں کو اُس کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہ میلان عشق کی حد تک تجاوز کر جاتا ہے اور اختتام میں وہ اس کو پا بھی لیتا ہے۔ حجلہء عروسی میں سج دھج کر بیٹھی دلہن " نقشبہ " جسے پیار سے " نقش" کہا جاتا ہے۔ اپنے دلہا عرشاں سے ایک پاکٹ تحفے میں حاصل کرتی ہے جس میں اس کے پسندیدہ جامن ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پہلی رات بھی انہی جامنوں سے لطف اٹھا کر شروع کرتی ہے جب جامن ختم ہو جاتے ہیں تو پھر عرشاں شوخی سے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر پلنگ کی طرف چل دیتا ہے جہاں پہلی بار جامنوں سے ہٹ کر نقشبہ کو ایک نئی لذت سے دوچار ہونا ہوتا ہے۔ اس کہانی میں فہمیدہ فارحہ تبسم نے مستقبل کے ایک عظیم فن کار کی علامتیں ظاہر کی ہیں۔ اس کو زیادہ بیانیہ یا مکالماتی نہ بنا کر بین السطور میں اگر رنگینی بکھرتیں تو اس افسانے کی نوعیت اعلیٰ فنی بلندیوں کی طرف ہوتی۔ ابھی وقت ہے اور ان بین السطور میں بیان کی جانے والی ٹھکی باتوں کو وہ رفتہ رفتہ اپنی گرفت میں لے آئیں گی اور بعید نہیں کہ وہ واجدہ تبسم، جیلانی بانو، رفیعہ منظور الامین، کی طرح ادب میں ٹمل ناڈو کی ایک عظیم " آپا " کہلانے کی مستحق ہو جائیں گی۔

انہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اساتذہ کا کلام بہ غور مطالعہ کریں اور شعری ادب کے لوازمات اور مطالبات کو پہچانیں۔ اس کے بعد ہی وہ غزل یا پابند نظم جیسی اصناف کی طرف اپنے ڈھنگ سے رجوع ہوں۔ فی الحال ان کی شاعری پر کچھ رائے زنی قبل از وقت بات ہے۔ اس میدان میں وہ ابھی مبتدی ہیں۔ ان کی آزاد نظموں میں ان کے اندر کے ایک فن کارہ کا احساس ضرور روشن ہے۔ مثلاً " بچھڑے ہوئے ساتھی کے نام "(نثری نظم ۔ غیر مطبوعہ) نظر نواز ہوئی۔ تھوڑی سی ترمیمات کے بعد اس نظم کو قاری تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

اس نظم کا ایک حصہ ملاحظہ کیجئے۔

کوئی میری
خوشی کی زبان نہیں سمجھتا
کسی کو
میری آنکھوں کا پیغام
نظر نہیں آتا

کہ

میری آنکھوں میں ایک جہاں آباد ہے

تیری یادوں کا

تیری خوشبوؤں کا

جو میں نے کبھی کھو دیا ہے

ساتھی!

اب تو آجا

کہ میرے اندر کا موسم بدل گیا ہے

یہ تیرے سانچے میں ڈھل گیا ہے

ان نظم میں اگر ابتدا میں اس ساتھی کے بچھڑ جانے کی اصل وجہ کسی ایک لفظ یا علامت کی مدد سے ظاہر کر دی جاتی تو آخر کے دو مصرعے اس نظم کی جان بن جاتے۔

کہ میرے اندر کا موسم بدل گیا ہے

یہ تیرے سانچے میں ڈھل گیا ہے

دوسری نظمیں اس نہج کی نہیں ہیں۔ بچوں کی نظموں میں بھی رائمنگ کا خاص خیال نہیں رکھا گیا۔ بچوں کی نظمیں گانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیونکہ انہیں زبانی سکھائی ہوتی ہے۔ بچوں کی نظموں میں یہ بات نہ ہو تو مقصد مفقود ہو جاتا ہے۔

ایک نظم 'بچوں کا ہلال' ماہنامہ 'ہلال' رامپور میں ۱۹۹۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ اس نظم میں وزن سے ٹوٹنے والے مصرعوں کو پڑھ کر کوفت ہوتی ہے۔ ہلکی پھلکی نظمیں ہی اس حالت کی ہوں تو پھر غزل جیسی عظیم شاعری کی طرف ان کا ڈھلنا کچھ ناممکن ہی معلوم ہوتا ہے۔

گڑیا رانی پی لو پانی

کھا لو کھانا پھر سو جانا

سوتے سوتے خواب ہے دیکھنا

پریوں کے سنگ جھولا جھولنا

جھولتے جھولتے اُن سے کہنا

تم ہی میرے ہمدم رہنا

میرا انگن بیت نہ جائے

تم سے ناتہ ٹوٹ نہ جائے

بہت پیاری نظم ہے مگر ان مصرعوں پر غور کیجئے۔ جو وزن سے خارج ہوتے ہیں۔
' خواب ہے دیکھنا ' اور جھولا جھولنا'' اگر ان مصرعوں کی طرف دھیان دیتیں تو یہ بچوں کے لئے بہترین نظم ثابت ہوتی۔ آخری کے دو مصرعے اپنا جواب نہیں رکھتے۔

میرا انگن بیت نہ جائے

تم سے ناتہ ٹوٹ نہ جائے

بہر حال ابھی فہمیدہ فارحہ تبسم کے آگے بہت طویل مستقبل روشن ہے اور ہم یہی دعا کرتے ہیں کہ وہ حیات خضر پا کر اردو کی خدمت کرتی رہیں اور ٹمل ناڈو کے خواتین کی عظمت کو چار چاند لگائیں۔

☆☆☆

رقیّہ محمودی بیگم

محمودی بیگم بنتِ عماد الدین محمد بلال بمقام مدراس ۵ شوال ۱۳۹۷ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۹۷۷ء میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد اپنے دور کے بہترین صحافی تھے جو اخبارِ " رہنمائے دکن " سے وابستہ تھے۔ چونکہ محمودی بیگم کی والدہ مدراسی تھیں، اس لئے آپ کی ابتدائی تعلیم مدراس ہی کے دینی و علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ ایس ایس ایل سی، انٹر، بی۔اے اور یم۔اے کی اعلیٰ تعلیم مدراس یونیورسٹی سے ہوئی۔ بچپن ہی سے اردو کا ذوق ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ بالخصوص اہلِ نائط کے خواتین میں یہ شعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے بے حد مقبول تھیں۔ آپ اسلامی موضوعات مثلاً " اسلام میں والدین کا مقام "، " اسلام میں انسانی حقوق "، " اسلام میں لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت "، " اسلام کے بنیادی اصول" پر بڑی پُر مغز معلوماتی تقاریر مختلف اسکولس اور اداروں میں کی ہیں۔ ایک سال کالج ڈے میں اسلام میں عورت کا مقام کے موضوع پر تحریری مقابلے میں اولین انعام و اعزاز پایا۔ موضوع " جہیز کی لعنت " پر آئے دن بہت کچھ لکھا گیا، لیکن محمودی بیگم نے ایک نئے زاویہ اور نئی پہنچ سے اس موضوع پر تقریر کی اور جلسے کے حاضرین کا دل موہ لیا۔ گویا آپ دس سال کی عمر سے یعنے ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۵ء تک اس میدان میں شہ سواری کی بلکہ اس میدان پر پوری طرح قابض رہیں۔

☆☆☆

امتہ الرحمان الفت النساء الفتؔ

امتہ الرحمٰن الفت النساء الفتؔ بمقام مدراس پیدا ہوئیں۔ ان کی تاریخ پیدائش اور وفات کے سن کا پتہ نہیں چلتا۔ اردو شاعری کی دولت انہیں ورثے میں ملی ہے۔ نعت گوئی ان کی زندگی کا ماخذ و منبع رہی ہے۔ خاندانِ والا جاہی کے مشہور و معروف اور ہر دل عزیز شاعر نواب عبد الرؤف خان پرتو کی اہلیہ تھیں۔ (۱) ظاہر ہے کہ جس گھر کی چھت کے نیچے انہوں نے زندگی کے لگ بھگ چالیس سال گذارے وہ اردو، عربی اور فارسی زبانوں کی مٹھاس اور سوندھی خوشبوؤں سے معمور و معطر رہے ہیں۔ ان کی شاعری کا سرمایہ "پرتو گلی" (Partau Street) کے بوسیدہ گھر میں دیمک کی غذا ان چکا ہے۔ تبرکاً دو شعر ان کی دختر احمد النساء سے تقریباً تیس سال پہلے میری والدہ (جو اُن کی سہیلی تھیں) نے سنے تھے۔

محمدؐ محمدؐ، ہمارے محمدؐ	بہت سوں کی بگڑی سنوارے محمدؐ
ہر اک سمت اُن کا ہی جلوہ ہے الفتؔ	نگاہوں میں دل میں ہیں پیارے محمدؐ

سنا ہے کہ موصوفہ نے اپنے شوہر کی ایماء پر ۱۹۲۱ء میں مولانا مولوی سید شاہ محمد حسین (۲) کے دستِ مبارکہ پر بیعت بھی کی تھی۔ الفتؔ کی پہلی دختر احمد النساء سے میری والدہء معظمہ شرف النساء (سیدانی بی مرحومہ) کے بہت گہرے روابط اور مراسم تھے۔ میں نے بھی اپنے بچپن میں احمد النساء اور ان کے شوہر عبد الرؤف صاحب کو (جو اردو کے پروفیسر تھے) میرے نانا (شاہ محمد مرتضٰی عرف آرکاٹ پیر) اور والدہ کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔ چونکہ ہمارا ننھیال، دادھیال مشائخین سے رہا ہے، ہمارے خاندان میں بھی اردو، عربی اور فارسی کا چلن عام رہا ہے۔ راقم السطور کے نانا نے ان کے اپنے ابا حضور کی رحلت پر جو فارسی مرثیہ لکھا تھا وہ آج بھی وصیت نامہ کی طرح خاندانی بزرگوں کے پاس محفوظ ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات: (۱) ماہنامہ "آج کل، ٹمل ناڈو نمبر" ٹمل ناڈو کے چند اردو شاعرات صفحہ ۲۲ از: کاوش بدری مطبوعہ ۱۹۷۹ء

(۲): مولانا مولوی سید شاہ محمد حسین نواب عبد الرؤف خان پرتو (المتوفی ۱۹۲۶ء) کے بھی پیر و مرشد تھے۔

ممتاز

آپ پروفیسر محبوب پاشا کی بہن، مدراس کے مشہور و معروف شاعر و ادیب نواب تجمل حسین خان گوپاموی (المتوفی ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۱ء) کی پوتی اور مدراس کی مقبول نعت گو شاعرہ مبشر النساء بیگم حیاؔ عرف دلہن بیگم کی چھوٹی بہن نواب غلام محمد علی خان پرنس آف آرکاٹ پنجم کی شریکِ حیات، اور غلام جعفر کی دختر نیک اختر تھیں۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر کی چار دیواری میں مولوی تجمل حسین خان کی سرپرستی میں ہوئی۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر کافی حد تک ملکہ حاصل تھا۔ اردو شاعری میں خود اپنے ابا حضور غلام جعفر اسلامؔ سے مستفیض تھیں۔ آپ نے اپنی بڑی بہن مبشر النساء بیگم حیاؔ سے بھی نعت گوئی کا فن سیکھا ہے۔ اور نعتیں بھی لکھی ہیں۔ آپ کا شعری حصہ شاید آپ کے خاندان کے تین چار احباب نے ہی دیکھا اور پڑھا ہے۔ بقولِ محبوب پاشا آپ کی شاعری کے ذوق کے پروان چڑھنے کے دوران ہی میں آپ کی شادی ہو گئی۔ اور ان کا یہ ذوق ادھورا ہی رہ گیا۔ لے دے کے ایک مرثیہ جو انہوں نے اپنے دادا حضور نواب تجمل حسین ایمان گوپاموی کی وفات پر لکھا تھا۔ پروفیسر محبوب پاشا نے راقم کے حوالے کیا ہے اور یہی نظم ڈاکٹر پروین فاطمہ نے بھی اپنی کتاب " والاجاہی خاندان کے تین شاعر "میں بطورِ حوالہ دیا ہے۔ (۱)

جنبشِ آہ ہے کافی دلِ سوزاں کے لئے — خلش درد ہے بس دیدۂ گریاں کے لئے
موت ہے اور ہے ایک ہستیِ بے مثل کی موت — نوکِ نشتر سے نہیں کم یہ رگِ جاں کے لئے
وہ محبت کی نظر تھی جو تصدق مجھ پر — یاد اب اُس کی ہے اک تیر رگِ جاں کے لئے
علم اور فضل سے تھا ان کو تعلق ایسا — جس طرح پھول کی ہستی ہو گلستاں کے لئے
نعت گوئی کا صلہ داورِ محشر نے دیا — خلد جاگیر ہوئی حضرت ایماںؔ کے لئے

دے مرے جد کو، خدا ہے یہ دعائے ممتازؔ
نعمتیں خلد میں جتنی ہوں مسلماں کے لئے

حوالہ : (۱) : والاجاہی خاندان کے تین شاعر از : ڈاکٹر پروین فاطمہ صفحہ ۹۴۔۹۳ مطبوعہ ۱۹۸۷ء

شوکت

قادر النساء بیگم شوکت خورشید احمد خان خورشید (ہزہائنس نواب عظیم جاہ ہفتم پرنس آف آرکاٹ کے نواسے) کی بیٹی اور نواب رؤف احمد خان پرتو کی بہن تھیں۔ خورشید احمد خان گوپامو (اترپردیش) کے رہنے والے تھے۔ اردو شعر وادب کی دنیا میں نوابین آرکاٹ کی خدمات یقیناً ناقابلِ فراموش اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اس کے روشن نقوش آج بھی تاریخ کے صفحات میں لازوال اور نمایاں ہیں۔ جیسا کہ راقم الحروف نے ''ٹمل ناڈو میں اردو'' میں لکھا ہے کہ نوابینِ آرکاٹ کی اقربا پروری اور قدردانی کی شہرت اور علم وادب کے اکابرین پر خزانے لٹانے کا شہرہ دور دور تک مسلط تھا۔ (۱)

نواب خورشید احمد خان نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مدراس آئے اور مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے۔ قادر النساء بیگم شوکت مدراس میں پیدا ہوئیں۔ خود شوکت کے ابا حضور خورشید اچھے شاعر تھے۔ انہی کے نگرانی میں شوکت کی ابتدائی تعلیم وتربیت ہوئی اور شعری ذوق بھی انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ گھر کی چار دیواری میں رہ کر اپنے بھائی نواب عبد الرؤف خان پرتو اور اپنی بھاوج امتہ الرحمان الفت النساء بیگم الفت کی رہبری میں اپنے ذوقِ شعری کو زندگی بخشی۔ شوکت کا ایک شعری مجموعہ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں نامی پریس سے شائع ہو چکا ہے جس کا ایک نسخہ راقم نے ''کتب خانہ اہلِ اسلام'' میں آج سے تیس برس پہلے دیکھا تھا۔ (۲)

قادر النساء بیگم شوکت کا کلام روایاتی قدروں کی پاس داری سے مزین ہے۔ نعت گوئی ان کی محبوب صنفِ سخن ہے۔ ہلکے پھلکے احساس سے بھرپور غزلیں بھی انہوں نے کہی ہیں۔ بعض غزلوں کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوفہ نے اپنے بھائی نواب رؤف خان پرتو کی غزلیات سے متاثر ہو کر اپنی شعری تخلیقات کی بنیاد رکھی ہے۔

شوکت کے تین اشعار کا حوالہ ڈاکٹر پروین فاطمہ نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ (۳)

دل اک پری جمال کا دیوانہ بن گیا یعنے چراغِ حسن کا پروانہ بن گیا

ایک شعر پروین فاطمہ نے یوں لکھا ہے :

اغیار نے کیا ہے جدا مجھ سے یار کو ہے ہے یگانہ تھا جو وہ بیگانہ بن گیا

لیکن اس شعر کا دوسرا مصرعہ میں نے یوں نوٹ کیا ہے

اغیار نے کیا ہے جدا مجھ کو یار سے ہم کیا جدا ہوئے کہ اک افسانہ بن گیا

شکرِ خدا کہ مست مئی عشق ہوں مدام شوکت یہ دیکھو دل مرا پیمانہ بن گیا

نعت کے بعض اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عشقِ نبیؐ کے سمندر میں ڈوب کر جو موتی نکالے ہیں وہ نایاب ضرور ہیں، ویسے بھی شوکت بڑی خوش قسمت ہیں جنھوں نے جدھر بھی نظر آئی اِدھر رسولِ اکرمؐ کا سراپا سامنے تھا۔ یہ ان کی جستجو اور آرزو کی معراج تھی۔

مری زندگی محمدؐ ، مری آرزو محمدؐ مری بندگی محمدؐ، مری جستجو محمدؐ

مجھے اور چاہئے کیا میں ہوں خوش نصیب شوکتؔ میں جدھر بھی دیکھتی ہوں رہے روبروئے محمدؐ

میری آنکھوں میں ہے تصویرِ شہنشاہِ زمنؐ خوبصورت نہیں لگتا ہے یہ دنیا کا چمن

٭

حوالہ جات

(۱) : ” ٹمل ناڈو میں اردو“ از : علیم صبا نویدی صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ ۱۹۹۸ء

(۲) : آج یہ بین الاقوامی شہرت رکھنے والا ” کتب خانہ “ والا جاہ روڈ سے غائب ہے اور ہمار اردو دان طبقہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش ہے۔ ایسا کیوں؟

(۳) : ” والا جاہی خاندان کے تین شاعر“ از : ڈاکٹر پروین فاطمہ صفحہ ۶۲ مطبوعہ ۱۹۸۷ء

مہر النساء بیگم

مہر النساء بیگم بنتِ سید فخر الدین ترچناپلی (قدیم نام ترو سیرت پلی یعنی مقدس عبادت گاہ)، میں پیدا ہوئیں۔ موصوفہ کے والدِ محترم ترچناپلی میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ آج سے اسّی نوّے سال پہلے ترچناپلی کا شمار اردو کے اہم مرکزوں میں ہوتا تھا۔ دورِ قدیم میں یہ مقام نہ صرف اردو علم وادب کا گہوارہ رہا، بلکہ یہاں کے علماء وفضلاء کی منور و معطر آماجگاہ بھی رہا ہے۔ بالخصوص یہاں کے بزرگانِ دین نے اپنے رشد وہدایت کی روشنی سے ایک عالم کو متاثر کیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی حضرت طبل عالم پاشا ہیں، جن کے فیوض وبرکات کی نور آور کرنیں آج بھی ٹمل ناڈو کی فضاؤں پر محیط ہیں۔ اسی مبارک اور مقدس ماحول میں مہر النساء کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ موصوفہ نے بیک وقت اردو، عربی اور انگریزی زبانوں میں مہارتِ تامہ حاصل کی۔ دن رات کتابوں کا مطالعہ اور اس مطالعہ کے بعد نتائج کا استنباط ان کا دیرینہ وصف تھا۔ اردو نثر نگاری کی طرف زیادہ مائل تھیں۔ ان کے مضامین " تہذیبِ نسوان"، "عصمت" اور " النساء" جیسے مقتدر رسائل میں بالالتزام جگہ پاتے رہے ہیں۔ مولانا عبد الرزاق بسمل حیدر آبادی نے اپنی تالیف " تذکرہ جمیل" میں ان کا ذکر بڑی عزت واحترام سے کیا ہے۔(۱)

موصوفہ کی مستقل تالیف " نامور خواتین اندلس" سے ان کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔

" ملکہ کے اقتدار کا کل یورپ میں شہرہ ہوگیا۔ یہ بادشاہ وملکہ سلطانہ صفیہ کی رضاجوئی کے طالب رہتے تھے۔ مگر صفیہ نے کبھی اپنے عظیم الشان اثر ورسوخ سے بے جا فائدہ نہ اٹھایا۔ کبھی عیسائی سلطنت کے فائدہ کے لئے کبھی اپنے عظیم المرتبت شوہر کی سلطنت کو نقصان نہ پہنچایا۔ وہ اپنے شوہر کی محبت والفت کی بہت قدر کرتی تھی"۔(۲)

حوالہ جات :(۱) ، (۲) تذکرہ جمیل از : عبدالرزاق بسمل حیدرآبادی، حصہ اول، صفحہ نمبر ۲۰۷، ۲۷۲ (مطبوعہ ۱۹۴۰)

جہاں آرا

جہاں آرا شہر مدراس کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والدِ محترم محمد حبیب اللہ صاحب مرحوم اچراپاکم ضلع چنگل پیٹ کے زمین داروں میں سے تھے۔ جہاں آرا کے لڑکپن میں ان کی گھریلو اور معاشی حالت اوسط درجے سے کچھ بہتر تھی۔ عموماً اس خاندان میں اعلیٰ تعلیم کا رواج نہیں تھا، مگر ضروری دینی اور مذہبی تعلیم کی طرف دھیان دیا جاتا تھا۔ جہاں آرا کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ان کے والدین وسیع النظر تھے اور خاندانی روایتوں کو توڑتے ہوئے انہوں نے جہاں آراء کے علاوہ اپنی تمام اولاد کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ جہاں آرا نے اپنی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہوبارٹ ہائی اسکول فار مسلم گرلس، مدراس میں حاصل کی اور پھر گریجویشن کے لئے مدراس پریسیڈنسی میں داخلہ لیا اور بی۔ ایس۔ سی کی سند حاصل۔ آگے چل کر انہوں نے یم۔اے اور یم۔ فل کی سندیں بھی پائیں۔ درس و تدریس کو اپنے لئے بہتر پیشہ قرار دیتے ہوئے (S.I.E.T) میں پروفیسر کے عہدے کو سنبھالا۔ چونکہ طبیعت میں حق گوئی اور غیر منصفانہ ماحول سے بغاوت کا جذبہ آپ میں بدرجہء اتم موجود تھا، اس لئے ہر جائز حق کے لئے آپ اپنی آواز بلند کرتی رہیں جس کی وجہ سے ایک ماحول ان کے لئے ناسازگار اور مخالف بن گیا جس کی انہوں نے کبھی پرواہ نہیں کی۔

طالب علمی کے زمانے میں وہ بہترین مقرر ثابت ہوئیں۔ اُن کی دھواں دار تقریروں سے تمام کالجوں میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ جو بھی موضوع ہو اپنی تقریر خود مرتب کرتیں۔ ان کے زبان وبیان میں بلا کی روانی، خیالات کی چستی اور جذبات کی عکاسی ہوتی تھی۔ اردو زبان پر اتنی دسترس حاصل تھی کہ موزوں الفاظ، تشبیہیں اور استعارے آپ خود ڈھلے چلے جاتے تھے۔ تقریر کے علاوہ اُن کو تحریر میں بھی بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنی بہت سی ساتھیوں اور طالبات کو حسبِ فرمائش کبھی تقریر لکھ دیا کرتیں تو کبھی دوسروں کی تحریروں کی نوک پلک درست کر دیا

کرتیں۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ جس میں خصوصی طور پر افسانہ نویسی ان کی چہیتی صنف تھی۔ جب یم۔اے کی طالبہ تھیں تو انہوں نے بڑی فرمائشوں کے بعد ایک افسانہ " ادھورا گیت" راقم اور محمد فضل الدین (جو جہاں آرا کے چھوٹے بھائی عنایت اللہ کے کلاس فیلو بھی تھے) کی گذارش پر " بزمِ علم وادب" مدراس کے سالنامے " گلِ نو"(مطبوعہ ۱۹۶۶) کے لئے عنایت کیا جو اسی سالنامے میں شائع بھی ہوا۔ (اس سالنامے کا راقم الحروف بھی ایک مرتب تھا)

اس دور مدراس میں اکیے دو کے فن کار ہی افسانہ نگاری کی طرف مائل تھے۔ ان کے افسانہ میں ایک حسینہ کے جذبات کی بھر پور س غمازی میں جہاں آرا نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نفسیاتی ڈھنگ سے اس کہانی کے دو اہم کردار کو اُبھارنے اور قاری کے ذہن پر ایک نقش چھوڑنے میں جہاں آرا طاق نظر آتی ہیں۔ افسانہ بہت مختصر سا ہے اور زبان وبیان کی لطافت اور شیرینی کے باعث قاری سے داد طلب کرتا ہے۔ اس افسانے کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

" تم میں ظاہراً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے......وہی انداز......وہی لب ولہجہ......
وہی باتیں......اپالو کے مجسمے کی طرح ویسے ہی خوبصورت جیسے کہ آج سے گیارہ
سال قبل تھے جب کہ میں تم سے ٹرین میں ملی تھی۔ تمہاری وہ مجموعی خوبیاں
میرے لئے ایک طوفان تھیں جس سے میرا وجود ایک حقیر تنکے کی طرح
بہہ گیا .... "

" ساری ساری راتیں میں نے جاگ کر کتابوں میں کھو کر کاٹی ہیں۔ لیکن یہ
ایک فریب تھا جو میں نے اپنے آپ کو دیا۔ وہ مادّیت، وہ سائنس کی پرستش،
فلسفہ سب ایک نقاب تھا جو کہ میں نے خود کو دھوکا دے کر اوڑھ لیا تھا۔ میں
نے تمہیں جتنا بھلانے کی کوشش کی، تم اور بھی زیادہ یاد آنے لگے۔ تم سے
دور ہونے کے بعد بھی میرے دل میں خلش تھی، ایک جستجو تھی، جو
تمہارے متعلق تمام معلومات حاصل کرنے پر اکساتی رہتی تھیں............ "۔

اس طرح کی تحریریں اُس دور میں کسی خاتون افسانہ نگار کے ہاں ملتی ہیں تو حیرت ہی کی بات ہے۔ کیونکہ اُن کا وہ دور دورِ خواتین نہیں تھا یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ خواتین آگے بڑھ کر خود کو پہنچوانے سے گریز کرتی تھیں۔ کاش اُس دور پر حاوی ادباء میں وسعتِ نظری ہوتی اور جہاں آرا جیسے گہر پارے تخلیق کرنے فن کاروں کو ایک دنیا سے متعارف کراتے۔ آج راقم کو یہی

بات بڑی حد تک اس طرف آمادہ کر رہی کہ ہر اُس پوشیدہ تخلیق کار کو کھوج نکالے جس میں بھرپور صلاحیتیں موجود تھیں اور جس کو پسِ پردہ ہی رہنے دیا گیا۔

آج وہ اپنے عہدے سے وظیفہ یاب ہو کر پُر سکون خانگی زندگی میں مصروف ہیں۔ کم از کم اپنی اس فرصت کی زندگی کو ادب کے لئے کار آمد بنائیں اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو دوسروں کی فیض یابی کے لئے صرف کریں۔

☆☆☆

قمر تاج

اسی دور میں محترمہ قمر تاج بیگم صاحبہ بھی اپنے طور پر مختلف کالجوں کے پلاٹ فارم پر بطورِ مقرر و محرر اُبھری تھیں جو بھی موضوع دیا جاتا اس پر تقریر و تحریر کی صلاحیتوں کو آزماتیں۔ مقالے لکھنا، ان کی دلچسپی کا ایک شعار تھا۔ ان کے جملے صاف ستھرے آسان اور جاذب ہوا کرتے تھے۔ آپ بھی پریسیڈنسی کالج، مدراس ہی سے ذہنی تربیت یافتہ تھیں۔ کالج کا ماحول ان دنوں بڑا سازگار تھا۔ با سلیقہ ادبی شعور رکھنے والا بہت بڑا خواتین کا حلقہ ان کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرتا۔ عصری ادب پر ان سب کی گہری نظر ہوتی تھی۔ خصوصاً افسانہ نگاری سے یہ حلقہ بخوبی متعارف تھا۔ انعاماتی مقابلوں کا جب موقعہ آتا تو یہ پورا حلقہ متحرک ہو جاتا۔ قمر تاج بیگم بھی ایسے انعاماتی مقابلوں میں دوستوں کی خاطر شرکت کر لیا کرتیں۔ ورنہ آپ خود کو پہنچوانے کے حق میں نہیں تھیں۔ ان کی تحریروں کا رنگ دیکھنا ہو تو ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ کیجئے جو ان کے مقالے سے ماخوذ ہے۔

> ” ہماری کتنی جوان بہنیں اس دنیا میں موجود ہیں جن کی شادیاں صرف اس لئے نہیں ہو سکیں کہ اُن کے والدین اُن کے ہونے والے رشتوں کے لئے منہ مانگے جہیز کا انتظام نہیں کر سکتے۔ آخر ان معصوم اور مظلوم بچیوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کس کی گردن پر ہے ؟ آج کتنے والدین ہیں جو صرف اپنی بیٹیوں کو جہیز دینے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے ہیں، دانے دانے کے محتاج ہو گئے ہیں،............(مطبوعہ ”گلِ نو “ مدراس ۱۹۶۶)

آج کل قمر تاج مدراس کے مشہور و مقبول علاقے رائی پیٹ میں ایک انگریزی درس گاہ کی پرنسپل ہیں۔ ان کے اندر نسوانی تعلیم کی اہمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے وہ سماج کی آئندہ بہترین نسل کے لئے ذمہ دار عورت کے خواب دیکھتی ہیں۔ انکے ہاں

تعلیم پانے والی ہر طالبہ ان کے اسی آئندہ سماج کے لئے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیر ہے۔ آپ جہیز کی بالکل مخالف ہیں۔ کسی پلاٹ فارم سے نہ سہی، انہیں اپنی درس گاہ سے ہی اپنا پیغامی پرچم لہرانا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو اپنی تحریری صلاحیتوں کو بھی مصرف میں لا کر کہانیوں اور افسانوں کی شکل میں سماجی بیداری کا کام کر سکتی ہیں۔ کیونکہ ان کی تحریروں میں بلا کی جاذبیت اور اثر موجود ہے۔

☆☆☆

مَہر طلعت آمبوری

ٹمل ناڈو کے بعض اوسط درجے کے شہر مثلاً میل وشارم، آمبور، وانم باڑی، ترپاتور، گڈیاتم، پرنام بٹ اور عمر آباد وغیرہ اسلامی تہذیب کے دلدادہ شہر ہیں۔ یہاں کے رسم ورواج، طور طریقے، رہن سہن اور بول چال کے انداز ہندوستان کے بہت کم شہروں سے میل کھاتے ہیں۔ پردے کی پابندی ان مقامات میں اتنی شدید ہے کہ عورت کی صورت تو کیا، اس کی آواز تک کو بھی محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کے ماحول والے شہر آمبور میں 8 ڈسمبر 1947 کو مہر طلعت نے آنکھیں کھولی تھیں۔ مذکورہ بالا شہروں میں تقریباً ڈھائی تین صدیوں سے اردو زبان پورے عروج پر آگئی تھی۔ یہاں تک کہ بازاری زبان ٹمل ہونے کے باوجود آپس کے مراسم کی زبان اردو ہوتی ہے اور خصوصاً یہاں کی خواتین کی زبان خلوص کی حد تک اردو ہے اور اس زبان کو سنبھالا دینے میں ان خواتین کا اتنا ہاتھ ہے کہ زمانے کے تازیانے کے باوجود ان کی گود میں پلنے والی نسلیں پوری ایمان داری سے اردو کو سنبھالا دیتے ہوئے سانس لے رہی ہیں۔ عورت کی زبان اگر اردو ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اردو کا گلا گھونٹ نہیں سکتی۔ مہر طلعت آمبوری کو وراثتاً اور اصولاً بھی اردو پروری کا موقعہ ملا ہے۔ ان کی تعلیم وتربیت کہاں ہوئی، کس طرح ہوئی اس کی تفصیل میں ابھی کسی نے کچھ نہیں کہا ہے۔ ڈاکٹر قاضی حبیب کی اطلاع کے مطابق مہر طلعت نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس ماحول میں ٹمل کا دور دورہ تھا اور اردو مہر طلعت کی اکتسابی زبان تھی۔(۱)

یہ کب سے لکھ رہی ہیں، اس کا صحیح اندازتو نہیں مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ 1965 کے آس پاس آپ پوری طرح اردو افسانہ نگاری کی طرف ڈھل چکی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب راقم الحروف کی ٹیپ بند نظمیں ماہ نامہ ''جمالستان''، ''خاتونِ مشرق'' دہلی اور ''بانو'' دہلی، ''پرستان'' دہلی میں بتدریج چھپتی تھیں۔ مذکورہ بالا دو جریدوں میں راقم نے دیکھا ہے کہ مہر طلعت آمبوری کے

افسانے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُس وقت سے موصوفہ سے متعلق راقم بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ 1967ء کے ماہنامہ "بیسویں صدی" دہلی میں ان کا ایک افسانہ "نازک رشتہ" پہلی مرتبہ راقم کو اپنی طرف مائل کیا تھا۔ اس افسانے کی تکنیک سے زیادہ اِس کا موضوع اتنا پسند آیا کہ اس کی وضاحت کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ بات اس لئے کہی جاتی ہے کہ عورت کی نفسیات کو سمجھنے میں ناچیز کو بڑی مدد ملی تھی اور آج تک وہ تاثر ذہن میں قائم ہے۔ خاتون افسانہ نگاروں مثلاً ممتاز شیریں، رفیعہ منظور الامین، جیلانی بانو، صالحہ عابد حسین، سلمیٰ صدیقی اور خدیجہ مستور کے قدموں کو چھونے والی مہر طلعت آموری اچانک ازدواجی زندگی میں بندھ کر اپنے قلم کو بھی زنجیروں میں باندھ دیا ہے۔(۲) افسوس ! یہ المیہ ان کے ساتھ کیوں پیش آیا؟ کاش وہ بھی مذکورہ بالا خواتین افسانہ نگاروں کی طرح آزاد فضاؤں میں اپنی فکری پرواز جاری رکھتیں۔ آج اگر وہ باقاعدی سے اپنی تخلیقات کے ذریعے ہم سے منسلک ہوتیں تو نہ معلوم وہ کس مقام پر ہوتیں۔ کشمیر جیسے جنت نما، روح پرور، بہار آفریں، فکر افروز، ماحول میں پہنچ کر بھی وہ آمبور جیسے ماحول کی عمدگی کو اجاگر نہیں کر سکیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ "نازک رشتہ" کی روبی کی طرح وہ اپنے "جمیل" کے ہاتھوں پوری طرح کچلی جا چکی ہیں۔ کیا واقعی قدرت نے اُن کے مستقبل کو ان پر الہام کر دیا تھا۔ یہ افسانہ ان کی ازدواجی زندگی کے آغاز سے پہلے تخلیق پا چکا تھا۔ کیا انہیں سزا دینے کے لئے ہی ان کا رفیقِ حیات "جمیل" بن کر آمبور پہنچ گیا اور انہیں قفس میں بند کر کے کشمیر لے گیا۔

مہر طلعت آموری کا افسانہ "نازک رشتہ" پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ عورت کے مزاج کے بہت سے گوشوں کو واضح طور پر اُبھار رہی ہیں، ان کا یہ رویہ اس لئے زیادہ معتبر ہے کہ ایک عورت ہی کسی عورت کی نفسیات کو بخوبی پہچان سکتی ہے۔ عورت کی نفسیات کی گتھیاں یوں سُلجھتی ہیں کہ وہ مختلف طور پر رشتوں کو تقدس کا درجہ دیتی ہے۔ اگر وہ بیوی ہے تو اس کی وفاداری اہم ترین ہے۔ اگر وہ بہن ہے یا ماں تو اُس کا تقدس قدرت کا سب سے بڑا اور نیک تحفہ ہے۔ اگر وہ سہیلی ہے تو اس سے بہتر دوستی کی حق دار کوئی نہیں ہوتی۔ خانوں میں ان مختلف رشتوں کو الگ الگ بانٹنے کی بجائے ایک ہی افسانے میں اتنے سارے رشتوں کی نزاکت پر سے پردہ ہٹانا اتنا آسان نہیں تھا۔ مگر مہر طلعت آموری نے بخوبی اس عظیم انسانیت کے مطالبات کا جائزہ لیا ہے۔ روبی اور نادر کا رشتہ بھابی اور دیور کے رشتے سے ہٹ کر بھائی اور بہن کے رشتے کا روپ دھارتے ہوئے اختتام پر ماں اور بیٹے کے رشتے تک وسعت پاتا ہے تو یہ بتدریج احساس قاری کو انسانی

تقدس اور بزرگی کا روح افروز احساس بن جاتا ہے۔ جب اس طرح کے رشتوں کے درمیان شک و شب کا زہر پھیلنے لگتا ہے تو عورت کس طرح ٹوٹ جاتی ہے۔ روبی کے آنسوؤں اور نادر کے موت کی بانہوں میں سمٹنے کے لمحوں کے مابین افسانہ دم توڑتا ہے تو بھی افسانے کے اختتام پر کی خاموشی، آنے والی صدیوں میں بھی جاری رہے گی اور کہتی رہے گی کہ ہر دور میں عورت کی مظلومیت اور مرد کے ظلم کے عمل کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ یقیناً مہر طلعت آموری کے مطبوعہ افسانوں "سازش"، "کانٹا" اور "کھنڈر کا فاتح" وغیرہ میں پائی جانے والی ایسی اچھوتی باتیں ذہنوں میں فکر کی لہریں پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اظہارِ بیان کو گنجلک بنانے کا عمل اکثر اوقات افسانے کی روح کو مجروح کر دیتا ہے۔(۳) اس حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے موصوفہ بول چال کی زبان کے بہت قریب پہنچ جاتی ہیں اور کبھی کبھی یہ زبان اتنی سادہ اور سلیس ہو جاتی ہے کہ بالکل ادبی زبان دکھائی نہیں دیتی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ افسانوں اور کہانیوں کی زبان ہی اس کی ادبی زبان ہے۔ افسانے کا قاری ہر ذہنی سطح کا ہوتا ہے۔ نچلے طبقے کا قاری بھی اس لئے اہم ہے کہ جو پیغام افسانہ نگار کو دینا پڑتا ہے وہ زندگی کے اہم مفروضات کو آسانی سے قاری تک پہنچانے کی ذمہ داری سے بری ہوتا ہے۔ مہر طلعت آموری اس حیثیت سے ٹمل ناڈو کی ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ ☆☆☆

حوالہ جات

(۱) : آموراور پرنام بٹ میں افسانہ نگاری از : ڈاکٹر قاضی حبیب سالنامہ " مشعل "ص ۳۰ مطبوعہ ۱۹۹۶ء

(۲) : بقولِ ڈاکٹر قاضی حبیب، مہر طلعت کی شادی ۱۲ جنوری ۱۹۷۰ء میں ہندوستانی فوج کے کپتان جناب علی راہی سے ہوئی اور موصوف نے ۱۹۸۲ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا کشمیر میں زیرِ تعلیم ہیں۔
" مشعل "ص ۳۰ مطبوعہ ۱۹۹۶ء

(۳) : آمور کے ایک بزرگ منشی کاتب محمد شریف نے یہ اطلاع بھی دی ہے مہر طلعت نے دو ناول بھی لکھے تھے، اور جو اشاعت کے لئے (مشورہ پبلی کیشنز) دہلی بھی گئے تھے۔ پھر پتہ نہیں ان ناولوں کا کیا ہوا ؟ اس پبلشر نے جناب رشید مدراسی کا ایک ناول " ہیرو " اپنے مطبع سے چھاپا تھا۔

آصفہ شاکر

ہندوستان کے کسی بھی شہر میں کوئی ایک محلہ یا کوچہ ایسا ہوتا ہے، جسے اُس شہر کی بڑے پیمانے پر پہچان ہوتی ہے۔ مدراس شہر میں بھی ایک ایسا علاقہ ہے جس سے اس شہر کا شہرہ دور دور تک ہے۔ جسے ہم ٹرپلی کین '' چوک '' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے علاوہ اردو زبان سے واقف ارباب واحباب کے لئے ''چوک'' مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ شادی بیاہ کے لوازمات عروس سے لے کر سجاوٹ کی ہر شئے کی خریدی کے لئے عورتوں، بچوں اور خاندانی بزرگوں کا جم غفیر یہاں ہمیشہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی چوک میں کتابوں کی دکانوں پر نوجوانوں اور ضعیف العمر بزرگوں کی کتب بینی اور خرید و فروخت کے دوران ان کی بات چیت اور ان کی چہل پہل بڑی پیاری لگتی ہے۔ یہ چوک دھلی کے اردو بازار، لکھنؤ کے امین آباد، ممبئی کے محمد علی روڈ، علی گڑھ کے شمشاد مارکیٹ، حیدرآباد کے چارمینار، بنگلور کے لشکر سے کسی طرح کم نہیں۔ بعض اوقات اس کو متعصب لوگ '' چھوٹا پاکستان '' بھی کہہ دیتے ہیں۔ کیونکہ شہر مدراس میں ٹرپلی کین کا علاقہ ہی ایسا ہے جہاں مسلمانوں کی گنجلک آبادی ہے اور یہاں چند مساجد تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً مسجدِ والا جاہی (بڑی مسجد کے نام سے مشہور ہے)، مسجدِ انوری (چھوٹی مسجد)، مسجدِ امیر النساء (جام بازار کی مسجد) وغیرہ۔ ان مساجد میں کئی بزرگ ہستیوں کے نام منسوب ہیں جہاں سے تبلیغِ اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ تعلیم علوم شرقیہ کا سلسلہ کم و بیش ڈیڑھ ڈھائی صدی کے عرصے پر جاری رہا۔ مولانا مولوی عبدالعلی بحر العلوم کے نام کے ساتھ والا جاہی مسجد اور مولانا مولوی سید مرتضےٰ پاشا قادری کے نام کے ساتھ مسجدِ انوری کا نام فوراً ذہن میں آجاتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں بزرگ ان مساجد کے دائیں جانب آج بھی اپنی آخری خواب گاہ میں آرام کر رہے ہیں۔ ٹرپلی کین محض ایک محلہ نہیں بلکہ اپنی جگہ ایک بھرپور شہر ہے جس کا سلسلہ ایک طرف چیپاک اور مونٹ روڈ سے ملتا ہے تو دوسری طرف رائی پیٹ اور میلاپور سے۔ میلاپوری بزرگوں کی ایک

الگ پہچان ہے، مگر ٹرپلی کین کے چوک سے وہ بھی اُسی طرح جُڑے ہوئے ہیں جس طرح مولانا بحر العلوم اور سید مرتضےٰ پاشا قادری۔ ان بزرگوں کے علاوہ مولانا طاہر صاحب عرف داداشاہ کا نامِ گرامی اسی دور میں اتنا روشن تھا کہ اُن کے نام سے آج بھی ایک کوچہ بہت مشہور ہے یعنی طاہر صاحب گلی۔ اسی طرح بعد کے دور میں مولانا سید علی رامپوری کا نام بھی اسی چوک کے علاقے میں اپنی روشنی پھیلاتا دکھائی دیا۔ ہر دور میں چوک اپنی آب و تاب قائم رکھتا رہا۔ آزادی کے بعد بھی اس کی انفرادیت قائم رہی جہاں کئی کتب خانوں اور کتب فروشوں کی دکانوں میں چہل پہل رہی۔ کریمی پریس، مدینہ پریس، شاہی پریس، ہمدرد پریس، عثمانی پریس، اختر پریس، اردو پریس، شالیمار پریس، شاہ الحمیدیہ پریس، شاکر پریس، گوہر پریس، مجیدیہ پریس وغیرہ نہ صرف کتابوں کے چھاپنے کے مراکز تھے، بلکہ بڑے بڑے علماء کی نشست و برخاست کی انجمنیں تھیں۔ یہاں اردو اور عربی کتابیں جب اشاعت کے لئے آتیں تو اشاعت سے پہلے ہی وہ اتنی مشہور ہو جاتیں کہ آپس میں ان کے چرچے ہونے لگتے۔ ایک دور ایسا آیا کہ ڈاکٹر عبدالحق، مولانا ابو الجلال ندوی، مولانا سید عبد الوہاب بخاری، مولانا سروش داوٗدی، مولانا سید عظمت اللہ سرمدی، مولانا ابو البرکات انور، مولوی سید سلطان بہمنی دیوان صاحب باغ کے علماء، خصوصاً مولانا ابو بکر نظمی اور مولانا عظیمی جیسی شخصیتیں بار ہا ان علاقوں میں ترتیب و تدوین و اشاعت کی مصروفیات میں دکھائی دیتی۔

" چوک " ایک مخصوص چوراہا ہی نہیں بلکہ وہ شش جہتی اشخاص کو کشیدہ اپنی طرف مائل کرنے والا ایک مرکز تھا۔ اسی چوک سے بہت سے رسائل اور کتابیں ہندوپاک کے کونے کونے تک پہنچائی گئیں۔ حضرت علی حسین مرحوم مالکِ مدینہ پریس مدراس کا چھاپہ خانہ اُن دنوں " آماج گاہِ علم وادب " تھا۔ یہاں کے مطبعوں سے شائع ہونے والے قدیم وجدید روزنامے ہفتہ روزہ، پندرہ روزہ، اور ماہناموں مثلاً جامع الاخبار ۱۸۴۱ ء، آفتاب عالم تاب ۱۸۴۹ ء، مخزن الاخبار ۱۸۵۰ ء، امیر الاخبار ۱۸۵۳ ء، صبح صادق ۱۸۵۴ ء، طلسم حیرت ۱۸۵۶ شمس الاخبار ۱۸۵۹ ء، میر اعظم، یادگار زمانہ، اتحاد ۱۸۶۴ ء، آفتاب رکن ۱۹۰۰ ء، قومی رپورٹ ۱۹۱۴ ء، رسالہ نور ۱۹۱۶ ء، آزاد ہند ۱۹۲۲ ء، مسلمان ۱۹۲۷ء، سفینہ ۱۹۲۸ ء، زندگی ۱۹۴۸ ء، فن کار ۱۹۵۰ء، غزل ۱۹۵۶ ء، فلم دیس ۱۹۶۱ ء، ساون ۱۹۶۷ ء، آشیاں کے تنکے ۱۹۷۷ ء، ادبی رپورٹ ۱۹۷۸ ء، نکتہ نظر ۱۹۸۷ ء۔ ان اخباروں کے

ذریعہ گھر گھر علم وادب کی روشنی پھیلی اور شعروادب کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔

شریف مدراسی کے دور سے لے کر عہدِ حاضر تک شعری، نثری، علمی، ثقافتی، تاریخی، مذہبی، تحقیقی موضوعات کی سیکڑوں کتابوں کی طویل فہرست بنائی جائے تو اس پر ''چوک''کی مہر ضرور لگنی چاہئے۔ اگرچوک میں ان کی اشاعت نہ بھی ہو تو ان کا چرچا چوک میں ضرور ہوتا ہے۔ نئی نسل کے لکھنے والوں کے لئے بھی یہی چوک کار فرما رہاہے۔ مولانا ابوالبرکات انور، منشی انصر الدین بے خود، مولوی سید سلطان بہمنی، عباس علی عباس، عبداللہ شرقی، منشی فخر الدین الفت، غلام رسول امین، ضیا فتح آبادی، سعد اللہ ممتاز، اشرف مدراسی، سید حمزہ حسین عبدالعزیز عادل، سروش داؤدی، عظمت اللہ سرمدی، نثار نگری، حیدر علی حیدر، دانش فرازی، ڈاکٹر عزیز تمنائی، مولانا اسمٰعیل رفیعی، بدر جمالی، مولانا فدوی باقوی، برتر مدراسی، نثار بھارتی، عبدالرؤف نیاز، راز امتیاز، ایس۔یم۔حیات، کاوش بدری، آثم کرنولی، گلاب مدراسی، کمال مدراسی، عبداللہ حسین عبد، سحبان مدراسی، راجی صدیقی، عظیم آمبوری، محی الدین عارف، سالک نائطی، اجمل سعیدی، بدر حیدر آبادی، قمر سعیدی، اختر آلندوری، فرحت کیفی، اصغر ویلوری، تنویر خیامی، نورس خیامی، حیات مدراسی، فیاض حسین، فضل جاوید، صلاح الدین برق، علیم صبانویدی، کاظم نائطی، یعقوب اسلم عمری، سہیل راشد، یوسف خواہاں، سلطان قدیر، علی حسین، اعجاز شاکری، حسن فیاض، لطیف نازی، فخر اعجاز، شریف رومانی، احمد صحابی (رامش رنگ نگری)، ساگر عظمی آکاش دیپ، سجاد بخاری، وقار نگری جیسی طویل فہرست بیرونی علاقوں مثلاً ویلور، وانم باڑی، آمبور، وشارم، ترپاتور، کرشنگری، دھرمپوری، کڈپہ، بلاری، کرنول سے علماء شعراء وادباء کی ایک بڑی لمبی جماعت اسی چوک کی طرف مائل تھی۔ ان سبھوں نے چوک میں اپنی ہنگامہ آرائیوں سے ماحول کو متحرک وفعال رکھا۔ آج بھی وہی چوک قائم ہے۔ مگراُس کی مرکزیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ اکاد کا چند اڈے باقی ہیں جہاں صرف کتب فروشی کا کام ہوتا ہے۔ ادباء وعلماء کا اٹھنا بیٹھنا اور اپنی محفلیں سجانا بالکل مفقود ہے۔

اس چوک کے احاطے میں خواتین کی بھی ہر دور میں علمی بیداری برقرار رہی ہے۔ یہاں سے کتابیں حاصل کر کے مطالعہ کرنے میں خواتین کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ شادی کے رسومات میں گائے جانے والے ترانے، قصائد، نعتوں کے مجموعے، اسلامی تواریخ، وغیرہ کی جب عورتوں کو ضرورت ہوئی تو وہ بذاتِ خود چوک پہنچ جاتیں اور اپنے ساتھ لائے ہوئے چھوٹے چھوٹے چپوں

کے باعث ماحول میوہ جات کی دکانیں اپنی بہار دکھاتی ہیں۔ رمضان کے روزوں کے دوران سر پر ٹوپیاں اوڑھے چھوٹے چھوٹے بچے چہل قدمی کرتے دکھائی دیتے ہیں تو ماحول بڑا مقدس ہو جاتا ہے۔ غرض اس حد تک چوک اپنی ایک الگ شان کا آج بھی حامل ہے۔

غالباً ۱۹۶۰ء کے آس پاس ایک نوجوان گروہ نے اردو زبان وادب کا پرچم یہیں لہرایا تھا جس کے تلے بعض پروانے ادبی ذوق کے ساتھ جمع ہونے لگے جن میں سے خصوصی نام اگر لیں تو بھی ایک بڑی فہرست بن سکتی ہے۔ اس فہرست میں اڈوکیٹ فیاض حسین، فضل جاوید، فخر اعجاز، صلاح الدین برق، محمد اعظم، پریم ظہیر ناز وغیرہم کے نام اس لئے اہم ہیں کہ انہوں نے ''کہکشاں''، ''کرن'' اور ''شگوفہ'' نامی قلمی پرچوں کا رواج ڈالا۔ ان قلمی پرچوں کی اہمیت اس دور میں اس لئے زیادہ بھی کہ ان کے آخری حصے میں پندرہ بیس صفحات خالی چھوڑ دئے جاتے تھے۔ جن پر قاری کو اپنے تاثرات لکھنا ہوتا تھا۔ گویا یک وقت رسالہ تخلیقی و تنقید کا پہلو لئے ہوتا اور سب سے بڑی سراہی بات یہ تھی کہ قاری کی ترش تلخ بات کو بھی جگہ مل سکتی تھی نہ صرف یہ کہ قاری دکھاوے کی شیرینی ہی سے کام لے۔ اسے اجازت تھی کہ وہ ترشی اور تلخی کو بھی روا رکھے۔ ایسی ہمت صحیح معنوں میں صحت مند ادب کو دعوت دیتی ہے۔ اس کی مثال ہندوستان میں کہیں نہیں ملتی۔ قلمی رسائل کا رواج تو ''دیوان صاحب باغ '' کی خواتین کا ایک مشغلہ تھا وہاں بھی کسی قاری کی مداخلت روا نہیں رکھی گئی تھی۔ قلمی رسالہ جوں کا توں قاری کے سامنے ہوتا، مگر قاری کا تاثر تخلیقی کار کے روبرو نہیں آتا، بعد میں اگر آیا بھی تو تحقیقی کاموں میں ہی برتا گیا۔

ان قلمی رسائل کی محفلوں میں شریک ہونے والی خواتین میں آصفہ بیگم کے نام نامی کا تذکرہ یہاں بہت ضروری ہے۔ آپ پروفیسر فضل الدین فضل جاوید کی چھوٹی بہن ہیں۔ قلمی رسائل کے دور میں وہ بہت کم سن تھیں۔ مگر علمی وادبی کاوشوں اور کارروائیوں کو خوبی جاننے پہچاننے کا شعور رکھتی تھیں۔ ایک طرح سے کہا جائے تو غلط نہیں کہ انہی قلمی رسائل نے آصفہ بیگم کا ذہن بنایا ہوگا اور ان میں تحریر و تخلیق کی رغبت پیدا ہوئی ہوگی۔

آصفہ بیگم مدراس کے چیپاک کے علاقے میں پیدا ہوئیں۔ جو ''چوک'' سے بہت قریب ہے۔ آپ کے والدِ بزرگوار کا نام اے۔ قادر محی الدین صاحب تھا۔ آپ کے والدِ محترم نے جس طرح اپنے فرزند محمد فضل الدین کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا، اسی طرح اپنی نورِ نظر آصفہ بیگم کے لئے بھی اعلیٰ تعلیم کی آرزو کی تھی جسے وقت نے بھی سہارا دیا۔ آصفہ بیگم نے ایس۔ آئی۔ ای۔ ٹی

کالج سے بی۔اے (نفسیات) کیا اور سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی سے یم۔اے (اردو) کیا۔ آپ نے مدراس یونیورسٹی سے ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ڈی کی سندیں بھی حاصل کیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ ناول نویسی کی طرف مائل ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک رومانی ناول "ریکھا" اپنی ایک سہیلی کی ایماء پر لکھا اور حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے یہ ناول ایک ہفتہ کے مختصر سے عرصے میں مکمل کیا تھا۔ وہ افسوس کے ساتھ کہتی ہیں کہ ان کا وہ قلمی ناول کہیں کھو گیا ہے۔ (S.I.E.T) کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران "شہنشاہِ ایران "مدراس آئے تھے۔ ان کی آمد سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک انگریزی مضمون کا اردو میں ترجمہ کیا جو کالج کے میگزین میں شائع بھی ہوا۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس مضمون کے ترجے میں فضل جاوید صاحب نے بھی اُن کی رہنمائی کی تھی۔ آصفہ بیگم ایک تاریخی ناول "آفتابِ عالم" سے متاثر ہو کر ایک افسانہ "ہولناک قربانی" کے عنوان سے لکھا اور اپنے اساتذہ کے روبرو پیش کیا اور افسوس کے ساتھ کہتی ہیں کہ اساتذہ نے انہیں یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ وہ بہت "دہشت ناک" کہانی ہے جس کی اشاعت سے ذہنوں پر غلط اثر پڑ سکتا ہے۔ غیاث اقبال کی اچانک موت کے سانحے سے آصفہ بے حد متاثر ہوئیں۔ اس تاثر کے تحت انہوں نے غیاث اقبال کی شخصیت اور کلام پر ایک مختصر سا مضمون لکھا جو (Queen Mary's College) کے میگزین میں شائع ہوا۔

یم۔ فل کے مقالے میں موصوفہ کا موضوع "راشد الخیری کے ناولوں میں نسوانی کردار" رہا۔ علامہ راشد الخیری نے طبقہ نسوان کے لئے ایک رسالہ "عصمت" کا اجراء کیا تھا۔ اس ماہنامہ کے ذریعہ موصوف کے خواتین کی ذہنی پرورش و پرداخت اور ان میں علمی ذوق پیدا کرنے کا اہم رول ادا کیا۔ مولانائے موصوف نے یہی کام اپنے ناولوں کے ذریعے بھی انجام دیا تھا۔ فی الوقت میرے پیشِ نظر آصفہ بیگم کا مقالہ تو نہیں ہے بلکہ میں اتنی بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آصفہ نے علامہ راشد الخیری کے انہی اصلاحی پہلوؤں پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہوگی۔

آصفہ نے پی۔ ایچ۔ڈی کے لئے "ٹمل ناڈو میں اردو غزل" کے موضوع انتخاب کیا تھا۔ اس موضوع پر مولوی نصیر الدین ہاشمی (۱)، حکیم شمس اللہ قادری (۲)، ڈاکٹر افضل الدین اقبال (۳) اور راقم (۴) نے جتنا کام کیا ہے اس کی مثال خال خال ہی نظر آئے گی۔ موصوفہ کی جرأت اندانہ کی داد دینی ہے کہ ان تمام تاریخی دستاویز کے مطالعے کے بعد بھی انہوں نے اس موضوع میں کچھ ضرور اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

بطورِ اضافہ موصوفہ نے جن لوگوں کو شامل کیا ہے، ان میں حضرت مخدوم عبد الحق ساوی، سید محمد والہ موسوی، حکیم محمد قادر علی بے ہوش، محمد تاج الدین خان، بہت، غلام محی الدین اثر مدراسی، محمد عبد الشکور بادشاہ صاحب بہادر شاکر، مولانا سید شاہ سلیمان حسینی، عظیم آثم ترپاتوری اور غلام احمد حیرت القادری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کا مکمل مقالہ بہ شمولیت مذکورہ بالا کل تراسی (۸۳) اہلِ علم و قلم ادباء و شعراء اردو کا احاطہ کیا ہے۔ مذکورہ بالا اہم ترین شعراء کے کام اور ادبی خدمات کا موصوفہ نے بڑی کاوشوں سے جائزہ لیا ہے اور جن ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں وہ معتبر اور مستند ہیں۔ حضرت مخدوم عبد الحق ساوی کے سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے معیار و مقصد کا تعین قابلِ ستائش ہے۔ حضرت عبد الحق ساوی کا نمونہء کلام حاصل کرتے وقت یا نقل کرتے وقت ان سے فروگذاشت تو ہوئی ہے۔ مگر اس کی اصلاح بعید الامکان نہیں، چونکہ جو تحریر راقم کے پیش نظر ہے وہ ایک خوش نویس کی خدمات حاصل کر کے تحریر کی گئی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کتابت کی فروگذاشت ہو۔ حضرت ساوی کی غزل کے چند اشعار موصوفہ نے پیش کئے ہیں۔ جو پہلی بار راقم کی نظر سے بھی گذرے ہیں۔ موصوفہ کی اس رسائی کی داد ضروری دینی ہے۔ موصوفہ کی ہر شخص سے متعلق تحقیقی مضمون کے آخر میں ذاتی رائے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس لئے ان کی آراء میں ذاتی صلاحیتیں مضمر نظر آتی ہیں۔

سید محمد والہ موسوی پر بھی کافی مواد جمع کیا گیا ہے اور ان کا نمونہء کلام جو حاصل کیا گیا ہے وہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ حکیم محمد قادر علی بے ہوش، محمد تاج الدین خان بہت، محمد عبد الرحیم گوہر ویلوری، غلام محی الدین اثر مدراسی وغیرہ کی تحقیق میں بہت سی باتیں جو اب تک کسی تذکرہ نگار کے قلم نے پوری طرح نہیں چھوا، موصوفہ نے ان پر اپنی تحقیقی کاوش برتی ہیں۔ سید شاہ حسینی، عظیم اثیم ترپاتوری، غلام احمد حیرت القادری ماضیء قریب کے ہی شعراء ہیں جن پر بھی دوسروں کی رسائی سے باہر کی باتیں کھوج نکالی ہیں۔ اسی طرح نصرتی پر بھی آپ نے بہت ساری معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر غیاث اقبال پر مواد حاصل کرنے کے لئے موصوفہ نے یقیناً مرحوم کی اہلیہ کا تعارف حاصل کیا ہوگا، کیونکہ غیاث اقبال کا نمونہء کلام بڑی مشکل سے ہی حصول کی حدوں میں تھا۔ آصفہ شاکر نے اگرچہ کہ ایک سند کے لئے مقالہ لکھا ہے تاہم ان کے اندازِ نگارش کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انہیں حصولِ سند سے زیادہ اپنے کام سے محبت تھی۔

اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث آصفہ شاکر ہر تحقیقی کام کو خلوص و ایمان داری سے آگے بڑھ کر اطمینان بخش طریقے پر اختتام تک پہنچا سکتی ہیں۔ مستقبل میں موصوفہ سے بہت ساری توقعات وابستہ ہیں۔ اس مقالے میں ایک بات راقم کو ضرور کھٹکتی ہے وہ یہ کہ جہاں انہوں نے اتنے سارے ادباء، شعراء اور علماء کا احاطہ کیا ہے وہاں چند ایک تک اُن کی رسائی نہیں ہوئی ہے۔ اس طرح یہ مقالہ ایک بہت بڑے خلاء کو جگہ دے رہا ہے۔ کبھی اس مقالے کی اشاعت کی ضرورت پیش آئے تو مزید تحقیق و تلاش سے کام لے کر جن کے نام چھوٹ گئے ہیں اُن کو بھی شامل کر لیا جائے۔

آصفہ بیگم آصفہ شاکر کے نام سے موسوم ہیں۔ کیونکہ وہ یم۔ یس۔ شاکر کی رفیقِ حیات ہیں۔ اپنے رفیقِ حیات سے انہوں نے ہر طرح کا تعاون حاصل کیا ہے۔ اپنے شوہر ہی کے باعث وہ تحقیقی کاموں کو آگے بڑھا سکتی ہیں۔ موصوفہ کے حسنِ اخلاق سے سبھی متاثر ہوتے ہیں۔ آج کل موصوفہ قائدِ ملت آرٹس کالج، مدراس میں اردو کی لکچرر ہیں۔ کالج اور گھر کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ آنے جانے میں جو وقت لگتا ہے، اور جو دقت ہوتی ہے اس سے ہر کوئی تھک سکتا ہے۔ پھر گھریلو کاموں میں مصروف ہو جانے کے باعث انہیں بہت کم وقت لکھنے پڑھنے کے لئے ملے گا۔ پھر بھی ان کی طبعی افتاد سے یہی امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اپنی ادبی تخلیقی سرگرمیوں کو جاری رکھیں گی اور افسانہ جیسی صنف کے ذریعے اپنی شناخت بنائیں گی۔ ان کی تحریروں میں سلاست روانی، سادگی اور حقیقت نگاری صاف دکھائی دیتی ہے۔ نثر میں وہ جو بھی لکھیں گی اُن کی (Originality) باقی رہے گی۔ کسی کی ہدایتوں کی اب انہیں ضرورت نہیں ہے۔ اسی ایک تمنا پر فی الحال ان سے متعلق بات ختم کی جاتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر پروین فاطمہ

پروین فاطمہ صاحبہ (بنتِ لطیف حسین صاحب مرحوم) کا شمار ٹمل ناڈو کی ان چنندہ خواتین میں سے ہے جنہوں نے اردو میں اپنی تحقیقی خدمات سے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ مدراس یونیورسٹی میں ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی شخصیت بڑی فعال اور شخصیت شاز رہی ہے۔ بہت ساری خواتین نے آپ کی نگرانی میں ٹمل ناڈو کی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے مقالات لکھے اور سندیں حاصل کیں۔ یہ بات بہت سراہنی ہے کہ خود نجم الہدیٰ صاحب اس بات کی اہمیت سمجھتے تھے کہ مقامی اسکالر ہی اپنی مضافات کی عظمت واہمیت کے علم بردار ہوں۔ وہی اس علاقے کی وقیع خصوصیات کو اجاگر کریں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی نظرِ التفات شاید پروین فاطمہ صاحبہ کی طرف کچھ زیادہ ہی رہی ہے۔ اس لئے وہ موصوفہ کی لیاقت اور ادبی فہم وبصیرت پر خاطر خواہ اعتماد رکھتے تھے۔

جس وقت پروین فاطمہ نے یم۔اے۔ کیا تھا تب سے لے کر ان کے یم۔ فل اور پی ایچ ڈی کی سندیں حاصل کرنے تک ڈاکٹر نجم الہدیٰ ان کے استادِ محترم رہے ہیں۔ اس طرح کے عظیم استاد کے ماتحت انہوں نے جتنے بھی مقالات لکھے، ان کی ادبی اہمیت قابلِ اعتماد اور مستند ہے۔ پروین فاطمہ نے یم۔ فل کے لئے ایک مقالہ "والہ جاہی خاندان کے تین شاعر ...... پرتو، شاطر، اور ایمان" لکھنا شروع کیا تو ان کے آگے والا جاہی خاندان کی پوری تاریخ اور خاندانی تفصیل کو جانچنے اور پرکھنے کی ذمہ داری آپڑی تھی۔ لازمی طور پر اس مقالے کو صرف تین شعراء پر ہی محدود کرنا ناممکن تھا۔ مذکورہ بالا مقالہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومتِ اتر پردیش، لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوا تو اس پر انہوں نے اپنے استادِ محترم ڈاکٹر نجم الہدیٰ ہی سے مقدمہ لکھوایا اور اس کتاب کو ہمیشہ کے لئے مستند بنادیا۔ بالخصوص راقم کو بھی اسی مقدمے نے کچھ لکھنے پر مائل بھی کیا ہے۔ اس کتاب کو موصوفہ نے چھ ابواب پر تقسیم کیا۔ (۱)

ابتدائی باب میں موصوفہ نے اردو شعروادب کی ترویج اشاعت میں خاندانِ والا جاہی کے اہم ترین رول کا مختصر سا جائزہ لیتے ہوئے ان تمام حقائق کو اجاگر کر دیا جن کا ذکر ناگریز تھا۔ یعنی نوابین کرناٹک کی سخن پروری، روسائے آرکاٹ کی شاعری، اس خاندان کے اہم شعراء اور شاعرات کا تذکرہ۔ کتاب کے صفحہ ۱۹ سے صفحہ ۶۵ تک یعنے تقریباً ۴۷ صفحات میں اختصار کے ساتھ کھپا دیا ہے گویا ایک سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا کام کیا ہے۔ نواب والا جاہ، ان کے فرزندان، نواب غلام حسین خان بہادر ممتازؔ، نواب محمد غوث خان بہادر اعظمؔ کی شاعری اور ادب نوازی کا جائزہ لیا۔ غلام محمد علی نواب عظیمؔ جاہ کے دور میں جو شعراء گذرے ہیں انکا اجمالاً تذکرہ ہی نہیں کہیں کہیں کسی اہم شخصیت کا حسبِ ضرورت جائزہ بھی لیا ہے۔

جن شعراء کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے، ان میں روسائے آرکاٹ کی طرف خصوصی دھیان دیا ہے ان میں نواب محمد محفوظ خان محفوظؔ، حافظ نواب منور خان امیر الامراء امیرؔ، نواب انور الدولہ سیف الملک بہادر خان جنگ مختارؔ، نواب علی حسن خان ماجد، وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے ہیں۔ پھر خاندانِ والا جاہی کے اہم شعراء میں غلام اعزالدین خان بہادر نامیؔ، حافظ شاہ انوار الحق نقشبندی انوارؔ، نواب نورالدین محمد خان انور حسین حشمتؔ، محمد معروف خان عالم خان فاروقؔ، ممتاز الملک غلام مرتضےٰ خان بہادر خادمؔ، غلام عبدالقادر شمس الدولہ، اعتضاد جنگ شمسؔ، محمد علیم اللہ خان بہادر مفید الدولہ پیروز جنگ علیمؔ، قادر علی خان بہادر منور جنگ نظیرؔ، مولوی عبدالغنی خان بہادر امیرؔ (برادرِ شاطرؔ)، محمد منور گوہرؔ، محمد محمود محمودؔ، (پرتوؔ کے نواسے)، مولوی غلام محمد جعفر اسلامؔ (فرزندِ ایمانؔ)، نواب قدرت احمد خان طلعتؔ، محمد امین الدین حسین خورشیدؔ، حیدر علی خان حیدرؔ (فرزندِ نواب مہدی حسن خان)، محبوب پاشاہ محبوبؔ (فرزندِ ایمانؔ) وغیرہ کا جائزہ بہت اہم اور ضروری تھا۔ یہ فہرست مکمل تو نہیں، مگر اہم شعراء میں اسی فہرست کو کافی سمجھ لیں تو بھی یہ کام واقعی بہت مشکل تھا۔ موصوفہ نے ان تمام سے متعلق جو معلومات حاصل کی ہیں وہ قابلِ داد ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس دور کی شاعرات میں لطف النساء بیگم اشمہؔ پر کافی دھیان دیا۔ نواب بیگم قادر النساء شوکتؔ، نواب بیگم امتہ الحی مبشر النساء حیاؔ، خدیجہ بیگم ضیاؔ، وغیرہ کی شخصیت اور شاعری کا بھی مختصر جائزہ لیا ہے۔

اس کے بعد موصوفہ اہم موضوعِ کتاب کی طرف آتی ہیں۔ اور تینوں شعراء پرتوؔ، شاطرؔ اور ایمانؔ پر جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی تحقیق کی خصوصیت کو پوری طرح اجاگر کرنے میں معاون

ہے۔ ان تینوں شعراء پر مزید کام کیا جا سکتا تھا، مگر مقالہ چونکہ ایم فل کے لئے تھا، صفحات کی تعداد کو مدِ نظر رکھ کر مقالے کی طوالت کو مزید پھیلنے نہیں دیا گیا۔ تاہم ان تینوں کی شاعری پر تنقید و تبصرہ کے ساتھ ساتھ ان تینوں کا کتاب کے آخر میں جو تقابلی جائزہ لیا گیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔

پروین فاطمہ صاحبہ ٹمل ناڈو کی خواتین میں سے بعض خواتین کے لئے رہ نما ہیں۔ خصوصاً وہ خواتین جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہونے کا دعویٰ کر رہی ہیں، اور اونچے اونچے منصبوں کی تلاش میں رہتی ہیں، ان کو دیکھ کر شرم کریں اور ان کی طرح بن کر دکھائیں۔ لوگ اپنی صحیح خدمات اور کارناموں ہی سے یاد رکھے جائیں گے۔ آج وہ خود کو کچھ بھی ثابت کرنے کی کوشش کریں، کل ان کا نام لینے والا بھی نہ ہوگا۔(۲)

ہمیں کسی اور موقعہ پر پروین فاطمہ صاحبہ کی دیگر تحریری خدمات کا جائزہ لینا ہے۔ فی الحال دستیاب مواد ہی کی روشنی میں انہیں تلاشا گیا ہے۔ ڈاکٹریٹ کے لئے انہوں نے جو مقالہ پیش کیا تھا اس کی وقعت یم۔ فل کے مقالے سے اس زیادہ ہی ہوگی جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

بعض احباب سے معلوم ہوا کہ حال ہی میں موصوفہ نے "ٹمل ناڈو کی اردو صحافت" نامی ایک کتاب بھی شائع کی ہے۔ امید قوی ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر صفی اللہ کی غلط بیانیوں پر مبنی تحقیقی کتاب "ٹمل ناڈو میں اردو صحافت" (۳) سے بھی زیادہ وقیع اور معلومات انگیز ہوگی جس کی طرف راقم نے "ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب" میں اشارہ کیا ہے۔

آئے دن ڈاکٹر فاطمہ کی چند ایک شعری تخلیقات بھی اِدھر اُدھر رسائل میں جگہ پائی ہیں۔ مطبوعہ تخلیقات کے آئینے میں موصوفہ کی شعری صلاحیتوں کا عکس نمایاں ہے۔ موصوفہ کی ایک نظم "مدرسہ ءِ ہوبارٹ" ان کے اسلوب کا ایک مہین عدسہ ہے جس سے ان کی شعر گوئی کی صلاحیتوں کے رنگ نکھرتے بکھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

حوالہ جات

(۱) : والاجاہی خاندان کے تین شاعر از :ڈاکٹر پروین فاطمہ مطبوعہ ۱۹۸ ء

(۲) :راقم الحروف کو نہایت افسوس اور دکھ ہے ڈاکٹر احمد ندیم کی حالیہ کتاب" آزادی کے بعد اردو نثر کا ارتقاء مطبوعہ ۲۰۰۰ ء)

میں نہ ہی پروین فاطمہ کر ذکر ہے اور ڈاکٹر نجم الہدیٰ کے زیرِ سایہ پروان چڑھی ہوئی خواتین کی طرف اشارہ۔ اس کے بر خلاف ایک ایسی خاتون کا ذکر ہے جس کا تخلص راقم الحروف کے تخلص کا سرقہ ہے جسے اردو ادب تو کیا " الف سے ی " تک کے حروف تہجی کی پہچان تک نہیں ہے۔ ٹمل ناڈو کے مفاد پرست پروفیسروں نے ایسے سفارشوں کے بل بوتے پر ایم۔اے کی سند دلائی ہے۔ اب پتہ چلا ہے کہ اُسے مفاد پرست پروفیسر زپی۔ ایچ۔ ڈی کی اعلیٰ ترین ڈگری سے مالا مال کرنے والے ہیں، گویا یہ دانش گاہِ علم اور تحقیق کے سودے میں پیش پیش ہے۔

(۳۰) : "مقامی نقاد" کی گرفت سے صاف صاف بچنے کے لئے ٹمل ناڈو میں اس کتاب کی ایک کاپی بھی منظر عام پر نہ لانے کا کام صاحبِ کتاب نے بڑی راز داری اور ہوشیاری سے کیا ہے۔ ٹمل ناڈو سے دور افتادہ مقامات کے دانشوروں تک اس کتاب کو اس لئے پہنچایا گیا ہے وہ اچھے تاثرات کی سندیں حاصل ہوں اور ان سندوں کو ڈھال بنا کر " مقامی نقاد " کے ہر حربے کو بے معنی قرار دیا جائے۔ دور افتادہ دانشوران کو کیا پتہ کہ اُس کتاب میں کہاں کہاں کس کس انداز سے غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہے۔

اس طرح کے معاملات میں پروفیسر صفی اللہ طاق ہیں ☆☆☆

نگار سلطانہ جلیلی

نگار سلطانہ جلیلی آمبور (ضلع شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والدِ محترم چیا عبدالجلیل صاحب نے اپنی تمام بیٹیوں کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص توجہ صرف کی ہے۔ آمبور کی روایت کے مطابق سب سے پہلے انہیں قرآن وحدیث کی تعلیم سے آراستہ کیا ہے گیا اور پھر بعد میں حسناتِ جاریہ گرلس ہائیر سکنڈری اسکول میں داخلہ کروایا گیا جہاں نگار سلطانہ نے چند سال تک اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ بہت کم عمری میں اُن کی شادی طے پاگئی اور وہ ورنگل (آندھرا پردیش) کے ایک تاجرِ چرم نوجوان کی رفیقِ حیات بن کر مستقل طور پر ورنگل میں قیام پذیر ہوگئیں۔

طالب علمی کے زمانے ہی میں نگار سلطانہ افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوگئی تھیں۔ اُن کے خاندانی واقعات سے متعلق بہت سی باتیں راقم الحروف کو محترمہ عطیہ کوثر صاحبہ کی وساطت سے حاصل ہوئیں۔ موصوفہ نے ہی نگار سلطانہ جلیلی کے تعلق سے یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی ہی میں بیس پچیس افسانے لکھے ہیں۔ اُن کا پہلا افسانہ "بے مثل ممتا" ماہنامہ "خاتونِ مشرق" دہلی میں شائع ہوا تھا۔ (۱) اسی ماہنامے میں اُن کے بہت سارے مختصر ترین افسانے وقتاً فوقتاً جگہ پاتے رہے ہیں۔ اُن کا ایک بالی ڈرامہ " داستانِ غم "بھی اسی ماہنامہ میں قسط وار شائع ہوچکا ہے۔ (۲)

ان کے بعض افسانے "پازیب" ، " چندن ہار " وغیرہ ماہنامہ " گلابی کرن" دہلی ، ماہنامہ " حریم " لکھنؤ اور " آج کی خاتون" دہلی میں چھپے ہیں۔

نگار سلطانہ کے تمام تر افسانے ہلکے پھلکے موضوعات کے حامل ہیں۔ محترمہ بالخصوص رومانی، اخلاقی اور ماحولیات کی بھرپور عکاسی کے لئے اپنی مثال آپ ہیں۔ انہوں نے افسانہ نگاری میں کسی طرح کی کرتب بازی یا نمائش کا اظہار نہیں کیا ہے۔ ان کی سوچ اور تحریر دونوں ان کی

فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ افسانوں کے کردار کے انتخاب میں اور اُن کو پیش کرنے کے ڈھنگ میں انہوں نے اپنی بہترین فن کارانہ صلاحیتیں دکھائی ہیں۔ انُ کے افسانوں میں خصوصی طور پر مقامی اسلامی تہذیب کے زندہ نقوش ملتے ہیں۔ شاید وہ ان نقوش کو اجاگر کرنا اپنا اہم ادبی فریضہ سمجھتی رہیں۔ آج نہ جانے کیوں وہ بالکل خاموش اور غیر فعال شخصیت بن کر رہ گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ قبل ازوقت بجھ کر رہ گئی ہیں۔ نگار سلطانہ بھی آمبور کی ایک اور مہر طلعت ہیں جن سے ادبی دنیا استفادے سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو کر رہ گئی ہے۔

حوالہ جات

(۱) اور (۲) : ڈاکٹر قاضی حبیب نے بھی اپنے مضمون " آمبور میں افسانہ نگاری "مطبوعہ سالنامہ "مشعل" اسلامیہ کالج وانم باڑی مطبوعہ ۱۹٦٦ء میں اسی بات کی اطلاع دی ہے۔

قمر جلیلی

نگار سلطانہ جلیلی کی بہن قمر جلیلی نے بھی اس خاندان کی بہت ساری روایتوں کو بر قرار رکھنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ قرآن و حدیث کے سیکھنے کا ڈھنگ ان کے ہاں کچھ عجیب سا رہا ہے۔ مولانا احتشام الحق صاحب مدظلہ (کراچی) کی تقاریر کے اکثر و بیشتر کیسیٹس اکٹھا کیں اور اُن کو سن کر انہوں نے اپنی مذہبی پیاس کو بجھانے کا سامان پیدا کیا۔ ایک طرف تو وہ مذہبی معلومات سے مستفیض ہوتی گئیں تو دوسری طرف شستہ اردو سے بھی مالا مال ہوتی چلی گئیں۔ پھر بھی انہوں نے محترمہ سواتی رضیہ بیگم سے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا۔ موصوفہ رضیہ بیگم حسناتِ جاریہ گرلس ہائیر سکنڈری اسکول میں اردو منشی تھیں انہوں نے اپنی شاگردوں میں اردو کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔

قمر جلیلی نے حسناتِ جاریہ ہی سے اپنی تعلیم مکمل کی اور سترہ سال کی عمر میں یعنے ۷ دسمبر ۱۹۷۸ء کو جناب عبداللطیف صاحب کی رفیقِ حیات بن گئیں۔ آج وہ تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کی ماں ہیں۔ بچپن ہی سے انہیں افسانے لکھنے اور پڑھنے کا شوق تھا۔ ہلکی پھلکی شاعری بھی کر لیتی تھیں۔ ماہنامہ "خاتونِ مشرق" دہلی، ماہنامہ "حریم" لکھنؤ اور سالنامہ "مشعل" وانم باڑی وغیرہ میں ان کی تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ عفت موہانی، اے۔ آر خاتون، زبیدہ خاتون، مسرور جہاں اور رضیہ بٹ سے متاثر تھیں۔ شعراء میں غالبؔ، میرؔ، اور اقبال کا انہوں نے انہماک سے مطالعہ کیا تھا۔ اس طرح ان کے اندر اپنے طور پر شعر گوئی کی صلاحیتیں پیدا ہو گئیں، مگر انہوں نے بالالتزام کسی کو بھی اپنا استاد نہیں مانا یا پھر انہیں اس کا موقعہ نہیں ملا۔ آج کل لکھنے پڑھنے کی انہیں مہلت نہیں مل رہی ہے۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف پوری طرح متوجہ ہیں۔

☆☆☆

سلیمہ سعیدہ

سلیمہ سعیدہ بنتِ محمود سعید (فرزندِ ابو سعید بہاؤالدین) کی ولادت ایک نائط گھرانے میں مدراس میں ہوئی۔ گھریلو دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ ہوبارٹ ہائی اسکول برائے مسلم خواتین، مدراس سے ایس۔ ایس۔ یل۔ سی اور بارھویں جماعت کے امتحانات پاس کئے۔ کوئنس میری کالج سے بی۔اے (تاریخ) اور ایم۔اے (تاریخ) میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئیں۔ بچپن سے اردو محبت اور لگاؤ رہا ہے۔ رسائل بینی اُن کا مشغلہ ہے۔ مگر ادبی رسائل بہت کم نظر سے گذرتے ہوں گے۔ کالج کی تعلیم کے دوران یہ تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتی رہیں۔ یم۔اے (تاریخ) کی سند حاصل کرنے کے بعد یم۔ فل (اردو) کے داخلے کے لئے انہوں نے بہت کوشش کی، مگر چونکہ یہ یم۔اے (اردو) کی سند نہیں رکھتی تھیں، اس لئے داخلہ پانے میں ناکام رہیں۔ آج کل وہ کسی ادارے سے یا ملازمتی شعبہ سے منسلک ہیں۔ خوشحال گھرانہ ہے، ملازمت کے لئے ابھی شاید سوچا نہیں ہے۔

سلیمہ سعیدہ کی اردو کی تعلیم بحیثیتِ زبانِ ثانی اسکول اور کالج میں ہوئی ہے۔ چونکہ انہوں نے یم۔اے۔ (تاریخ) انگریزی میں کیا تھا اس لئے اردو کی ادبی زبان سے وہ کچھ حد تک نابلد ہیں۔ ان کی زبان پر دکھنی زبان کا زیادہ اثر دکھائی دیتا ہے۔ ان کی تحریروں میں دکنی زبان کے اثرات ہی زیادہ نمایاں ہیں۔ نثر میں روانی تو ہے، مگر کہیں کہیں عبارت میں ''علامتِ فاعل'' اور ''علامتِ مفعول'' کا استعمال صحیح ڈھنگ سے نہیں ہوا ہے۔ یہ قدیم دکھنی ہی کی خصوصیت ہے۔ ان کی تحریر سے دکن والوں کو کسی طرح کی کوفت نہیں ہوگی مگر ان کی تحریر کے انداز کو شمال والے شاید پسند نہ کریں۔ بات کی وضاحت میں سلیمہ سعیدہ بڑی ماہر ہیں۔ ایک تاریخ کی طالبہ ہونے کے باعث وہ تسلسل واقعات کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ راقم الحروف کے پیشِ نظر ان کا تحریر کردہ ''بیجاپور کا خاندانِ صبغۃ اللٰہی'' نامی مقالہ ہے جس میں اہم ترین اُنیس بزرگوں کی سوانح حیات، ان کے ادوار کے سماجی، معاشی اور مذہبی حالات کا جائزہ، اسلامی تہذیب و تمدن اور صوفیانہ طور

طریقوں وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہے۔ ان انیس بزرگوں کے علاوہ بے شمار دیگر اہم ترین صوفی شخصیتوں کو بھی اپنی تحریر کے احاطے میں لاکر مقالے کو بہت جاندار اور وقیع بنانے کی کوشش کی ہے۔ اتنا سارا مواد جمع کرنا کچھ آسان نہیں ہے اور معلوم نہیں کہ وہ کن وسائل سے انہیں اخذ کیا گیا ہے۔ کیونکہ مقالے میں ماخوذات کا حوالہ کہیں بھی نہیں ہے۔ شاید انہوں نے ایم۔ فل کے لئے یہ مقالہ لکھا ہو۔ اگر وہ اس کو حوالوں کے بغیر پیش کرتیں تو وہ ہرگز سند نہ پاتیں، کیونکہ یونیورسٹیوں میں یہ ضابطہ ہے کہ حوالے کے طور پر کسی کتاب کو یا کسی طبع شدہ تحریر کو پیش کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ سلیمہ سعیدہ کے پاس حوالہ جات کی فہرست بھی ہو۔ جسے اس مقالے میں نقل نہ کیا گیا ہو۔ بہت سے مقامات پر معروف واقعات کو پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے ہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست اور قابلِ اعتبار ہے۔ یہ مقالہ اگر شائع ہوجاتا تو محققین اس کی قدر و قیمت کا پتہ چلا سکتے ہیں۔

ان کے مقالے کا اندازِ تحریر ملاحظہ کیجئے:

"میاں نصرتی جو نظم دکنی یعنی "گلشنِ عشق" کے مصنف تھے، جب حضرت (سید میراں محمد مدرس حسینیؒ) کی خدمت بیعت کے لئے آئے تو حضرت پوچھے کہ تم کس سلسلے میں مرید رکھتے ہو اور کس بزرگ سے عقیدت رکھتے ہو۔ نصرتی نے کہا: حضرت خواجہ بندہ نواز محمد گیسودرازؒ سے عقیدت رکھتا ہوں پس آپ نے ان کو سلسلہء چشتیہ میں مرید کئے اور فرمایا کہ تم خواجہ بندہ نوازؒ کی تعریف میں اشعار لکھو، کیونکہ تم حضرت سے بڑی عقیدت رکھتے ہو"۔

اس مقالے میں سب سے اہم ترین حصہ راقم کی نظر میں وہ ہے جس کا عنوان "تذکرہ اولیائے تاج پورہ" ہے۔ اس تذکرے میں "خاندانِ صبغتہ اللّٰہی" کے جن بزرگوں پر سلیمہ سعیدہ نے کام کیا ہے وہ پوری طرح معتبر دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ راقم ان بزرگوں کے تعلق سے ایک عرصہء دراز سے عقیدت اور محبت رکھتا ہے اور اس کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ راقم کے ننھیال اور دادھیال دونوں طرف سے اس خاندان سے نسبتی تعلقات ہیں۔ یہ بات محض برسبیل تذکرہ کہنی پڑرہی ہے۔ ان پر راقم کسی موقع پر کھل کر روشنی ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سلیمہ سعیدہ کو پُر خلوص رائے دی جاتی ہے کہ وہ اس تحریر میں کسی اہم ادبی شخصیت کی مدد لے اور اس مقالے کی زبان و بیان کی صحت کرانے کے بعد اُسے اس قابل بنائیں کہ ایک غیر دکھنی قاری بھی ان بزرگوں کے واقعات سے مستفیض ہو سکے۔ ☆☆☆

ڈاکٹر سلمہ صلاح الدین

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شہر مدراس میں جس دور میں محمد صلاح الدین باشا برق (۱) ہماری ادبی دنیامیں برق رفتاری سے لہرا کر ایک باشعور علمی طبقے پر اپنی تمام تر ادبی فکری جلوہ طرازیوں کے ساتھ مسلط ہوئے تھے۔ اس دور میں موصوف کی نئی ہوش مندی، دروں بینی اور انتقادی نظر سے بہت کم شاعر اور ادیب خود کو بچا سکے ہیں۔ ان کی صحبتوں میں فرحت کیفی، راز امتیاز، کاوش بدری، لیس یم حیات، ادیب بھارتی اور احقر کے بہت سارے روز و شب یونہی نہیں گذرے تھے بلکہ سبھوں نے ایک دوسرے سے حسبِ حوصلہ واستطاعت استفادہ کیا تھا۔ موصوف کی زندگی میں اسی دور میں اچانک ایک مبارک دن طلوع ہوا اور وہ بھی پوری شان و تمکنت کے ساتھ طلوع ہوا۔ جس میں خوشبوؤں میں ڈوبتی ہوئی سلمہ بیگم (راقم کے ادبی دوست محمد فضل الدین فضل جاوید (۲) کی بہن سلمہ) برق کی روشنی بن گئیں جسے عام زبان میں رفیق حیات کہتے ہیں۔ اس تبدیلی سے پہلے بھی ہر اتوار کو فضل الدین کے دولت کدے پر مذکورہ بالا احبابِ فکر و نظر کی جگہ ایک نیاز مرۂ احباب جمع ہوا کرتا تھا جہاں محمد قدرت اللہ باشا، محمد عبداللہ اور ڈاکٹر محمد علی اور راقم کی نشتیں بڑی حیات آفریں اور دل نشین ہوتی تھیں۔ فضل الدین کے دولت خانے کے لذیذ پکوان، ان کی فرج کی آئس کریم اور فالودہ ہم سب کے لئے نعمتِ عظمہ سے کم نہیں تھے۔ ان نشتوں کے دوران ہی راقم کو سلمہ بیگم کے صحیح علمی وادبی ذوق کا پتہ چلا تھا غالباً وہ اس وقت بی اے کی طالبہ تھیں۔ اردو کے ہر تقریری مقابلہ میں وہ پیش پیش رہتی تھی ان کی تقریروں کی شستہ وشائستہ زبان پر راقم کو گمان ہو چلا تھا کہ یقیناً ان تقریروں کے پسِ منظر میں کسی اور ہی کا ہاتھ ہوگا۔ کھوج اور جستجو کے بعد اطمنان ہو چلا کہ سلمہ ہی کی لگاتار محنتیں اور مسلسل لگن ان کی اس طرح کی تحریروں اور تقریروں کا پیش خیمہ ہیں۔ راقم کو اس بات کا بھی علم ہوا کہ سلمہ اپنے بڑے بھائی فضل الدین سے بھی کسی قسم کا مشورہ قبول کرنے کے حق میں نہیں ہوتی تھیں۔ خود اعتمادی سلمہ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی ان کی تقرروں کے آگے جناب خلیل الرحمٰن (فرزند حضرت آثم کرنولی) جناب فیاض حسین، جناب قاضی جناب محمد اعظم وغیرہ کی دھواں دھار تقاریر بھی پھیکی پھیکی سی لگنے لگتیں تھیں۔ اس دور میں پروفیسر رحیم احمد فاروقی، پروفیسر حیدر علی خان حیدر، پروفیسر محبوب پاشا، پروفیسر فضل اللہ، پروفیسر سروش داؤدی جیسے نگران اور سرپرست ہستیاں اس جوان طبقے کی کارگزاریوں کا جائزہ لیتی تھیں۔ ایسی عظیم دینی علمی اور ادبی ہستیوں کے تعلق سے موضوعات بھی دینی ادبی اور علمی ہوا کرتے تھے سلمہ ہر موضوع

کو بڑی متانت، سنجید گی، ژرف بینی اور کامیابی کے ساتھ نبھاتیں اور اولیت کا سہرا انہی کے سر بندھتا اس دور کو ان کا زرین دور کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

موجودہ دور میں سلمہ صلاح الدین سے متعلق بعض احباب کا یہ خیال ہے کہ وہ قدیم سلمہ نہیں رہیں بلکہ "شبیر احمد سعید ویمنس کالج" کی محض ایک پرنسپل بن کر رہ گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ آج بھی وہی جنیس (Genious) سلمہ ہیں مگر منصبی بلندی نے ان کی ادبی بلندی کو پست کر دیا ہے۔ منصبی ذمہ داریوں کے بوجھ سے دبنے والوں میں ایسے جنیئس کبھی پست نہیں ہوتے جس کی مثالیں بھی ہمارے پاس آج بھی موجود ہیں۔ مولانا سروشؔ داؤدی پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نقاد، عالم، مقرر، شاعر اور ادیب ہی رہے۔ مولانا عظمت اللہ سرمدؔی نے بھی اپنی ادبی و علمی انفرادیت کو سالم رکھا اور اپنی پروفیسری میں بھی بہترین تخلیقی جوہر دکھائے۔ یہ بات اور ہے کہ بعض لوگ صرف منصبی ہیں اور مظاہرہ اس بات کا کرتے ہیں کہ ان سے بہتر محقق، ادیب اور افسانہ نگار شہر مدراس میں اب تک کوئی نہیں پیدا ہوا مدراس کے ماحول میں ایک محترمہ ایسی بھی ہیں کہ وہ محض "بے معنی صفر ہیں" مگر کسی ایک عدد کے پیچھے لگ کر "بامعنی صفر" Significant Zero بننے کی کوشش کرتی ہیں۔

دکھ اس بات کا ہے کہ اب برق بھی زیادہ کوندتے دکھائی نہیں دیتے۔ اس لئے کہ (Directorate of public Prosecution) کا دفتر ان کے قلم کی جولانیاں چھین چکا ہے برق اور سلمہ کی یہ خاموشی ادبی دنیا کو بڑی کھل رہی ہے راقم کی تمنا یہی ہے کہ وہ دور پھر واپس آجائے۔ جو کبھی ان کے مکانات کی چھتوں پر ادبی ہلچل مچایا کرتا تھا۔ (۳)

آج بھی ان دونوں کے سفر میں منزل کی روشنی برقرار ہے اور ان کے آس پاس اردو کے وہ معطر د منور راستے موجود ہیں جہاں بہاریں ہیں، پھلجھڑیاں ہیں اور زندگی کا تحرک ہے۔ جن راستوں پر میرؔ و غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کے چہرے جگمگا رہے ہیں جن پر ہم عصر شعراء اور ادبا کی نئی اقدار کے کرشمے اپنا جادو جگا رہے ہیں۔ کیا سلمہ اور برق دونوں کو اپنے آس پاس کی اس دنیا کا احساس نہیں ہے ____؟

حوالہ جات

(۱) ٹمل ناڈو کے مشہور معروف افسانہ نگار اور خلیل جبران کے معتبر مترجم۔۔۔ مقامی رسائل میں برق کی تخلیقات چھپ چکی ہیں۔

(۲) ٹمل ناڈو کے مقبول طنز و مزاح نگار اور افسانہ نگار جنکے تین افسانے "روشنی کے بھنور" (مطبوعہ ۱۹۶۰ء) میں شائع ہو چکے ہیں

(۳) یہ دونوں مکانات ٹمل ناڈو مدراس کے اردو مرکز "چوک" کے آس پاس ہیں سلمہ اور صلاح الدین کے دونوں خاندان اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی روشنی سے معمور ہیں۔

نزہت نازنین

نزہت نازنین کی پیدائش وانمباڑی (ضلع شمالی آرکاٹ) میں ادب نواز اردو داں گھرانے میں ہوئی۔ اسی شہر کے ایک کہنہ مشق خوش بیان جوان فکر شاعر عبدالرؤف نیاز مرحوم (مصنف ''من وعن'' مطبوعہ ۱۹۹۸ء) کی نزہت نازنین بھتیجی ہیں اور انہیں اس تعلق پر ناز بھی ہے۔ بچپن سے ادبی ماحول انہیں نصیب ہوا اور اس ماحول میں انہیں اردو ادب کی کتب اور رسائل پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ مطالعہ کا شوق دھیرے دھیرے تحریری جولانیاں دکھانے پر اُبھارنے لگا تو نزہت نازنین نے خود کو افسانہ نگاری کی طرف مائل کر لیا اور اب تقریباً انتیس تیس افسانے اور کہانیوں کی آپ تخلیق کار ہیں ان میں سے تقریباً سبھی کہانیاں مختلف رسائل مثلاً ''پاکیزہ آنچل''، ''مشرقی آنچل''، ''مشرقی دولہن'' دہلی، ماہنامہ ''بتول'' اور ''نور'' میں شائع ہو چکی ہیں۔ شوقیہ طور پر انہوں نے لکھنا شروع کیا تھا اور یہ شوق ان کا فن بن کر بروئے کار آیا۔ ازدواجی زندگی میں بندھنے کے بعد دو خوبصورت بچوں کی ماں بھی بن گئیں۔ تاہم فرصت نکال کر کچھ نہ کچھ لکھنے پر خود کو آمادہ کر لیتی ہیں خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کے رفیق حیات بھی ادب نواز ہی ثابت ہوئے ہیں بلکہ نزہت صاحبہ کا کہنا ہے کہ وہ ان کی تخلیقات کے پہلے ناقد ہوتے ہیں جس کے باعث نزہت کو سنبھل کر قلم سے کام لینا پڑتا ہے۔ اکثر افسانے ان کے رفیق حیات کی تنقید سے نکھار حاصل کر چکے ہیں اور نزہت خدا کی شکر گذار ہیں کہ انہیں اپنی پسند کے مطابق نوازا گیا ہے۔

نزہت نازنین، وانمباڑی کی دیگر خواتین افسانہ نگاروں ہی کی طرح ادبی سفر میں گام زن ہیں اور ان کے افسانوں اور کہانیوں کی تکنیک، لہجہ، ڈکشن کچھ زیادہ مماثل نہیں بھی تو ان کی انفرادیت ایک حد تک متعین ہوتی ہے۔ کہیں ان کا انداز دھیمی اور متوازن رفتار سے چلنے والے سلو لائیڈ کی

تصویر لگتا ہے تو کہیں غیر متحرک البم کے اوراق سا ہے۔

ماہنامہ "مشرقی آنچل" دہلی میں ان کے دو مطبوعہ افسانوں کے مطالعہ کا موقعہ راقم کو ملا ہے اس رسالے کے اکتوبر ۱۹۹۱ء کے شمارے میں "کس شان سے بہار آئی" اور مارچ ۱۹۹۹ء کے شمارے میں "ثباتِ دوام کہاں" کو پڑھ کر یوں لگا کہ اول لذکر کہانی ایک "ناولٹ" سی ہے۔ کسی تھیٹر میں بڑے پردے پر تصویر دیکھنے کا لطف سا محسوس ہوا۔ ان کے کرداروں میں بھر پور زندگی، ہلچل اور رفتار موجود ہے۔ چست مکالموں سے کہانی کہیں بھی بور ہونے نہیں دیتی۔ چند ایک کردار ذہن میں اپنا اٹوٹ نقش بنا لیتے ہیں۔ نزہت نازنین اگر ناول نگاری کی طرف توجہ دیں تو یقیناً بہت کامیاب ہوں گی

دوسرے افسانہ "ثباتِ دوام کہاں" پڑھنے پر ایسا لگا کہ کسی منی پردے پر جرائم کی دنیا میں جاسوسوں کو دکھائی جانے والی غیر متحرک تصویریں ہوں۔ کہانی کا پلاٹ اتنی تیز رفتاری سے گذرتا ہے کہ دس سال پر مبنی بھر پور نسل کا وقفہ صرف دو یا تین منٹ میں گذر جاتا ہے۔ خوابوں میں کھوئی سولہ سترہ سال کی دوشیزہ کہانی کے دوسرے ہی صفحہ میں چار پانچ نوجوان لڑکیوں لڑکوں کی ماں بن جاتی ہے اور تیسرے صفحہ میں پوری کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری کہانی پہلی کہانی سے تقریباً آٹھ سال بعد طبع ہوئی ہے مگر پہلی کہانی کا نکھار اور تکنیک کی پختگی دوسری کہانی میں نہیں ہے۔ گمان گذرتا ہے کہ انہوں نے اپنی ابتدائی مشق کی کوئی کہانی بہت بعد میں طبع کرائی ہو۔

بہر حال وانمباڑی کی بہت ساری قابلِ تحسین افسانہ نگاروں کی صف میں یہ بھی آکھڑی ہوئی ہیں۔ ابھی ان کے قلم میں تازگی ہے، ماحول سازگار ہے خانگی زندگی بھی انہیں ایک حد تک اجازت دیتی ہے وہ ضرور خود کو فعال اور متحرک رکھیں گی اور ٹمل ناڈو کی آبرو بن کر ہمارے افسانوی ادب میں منزل بہ منزل، افق بہ افق روشن نقوش چھوڑیں گی۔

سپاس نامہ

محمد جعفر، ایم. اے.، ایم. فل. : حیدر آباد

جنہوں نے سنٹرل یونیورسٹی آف حیدر آباد سے مقالہ ''علیم صبانویدی حیات اور کارنامہ'' لکھکر ایم. فل. کی سند حاصل کی

محمد قاسم. ایم. اے.۔ پی. ایچ. ڈی : کیرلا

جنہوں نے پروفیسر ناز قادری، شعبہ اردو بہار یونیورسٹی، کے زیر نگرانی مقالہ ''علیم صبانویدی کی ادبی خدمات'' لکھ کر پی. ایچ. ڈی. کی سند حاصل کی

مولانا کاظم نائطی، بی. یس. سی، بی. ایڈ.، ایم. اے. (اردو، انگریزی)

جنہوں نے علیم صبانویدی کے فکروفن پر نقدو نظر کا گراں بہا اور وقیع مقالہ ''لہجہ تراش'' سپردِ قلم کیا۔

مولوی حکیم محمد یعقوب اسلم عمری، ایم. اے. (علیگ)

جنہوں نے ''عکس در عکس'' نامی مبسوط کتاب کی صورت میں علیم صبانویدی کی شخصیت کا جائزہ پیش کیا۔

پروفیسر محمد علی اثر، ایم. اے.، پی. ایچ. ڈی. حیدر آباد

جنہوں نے علیم صبانویدی کے نام آئے ہوئے مشاہیر ادب کے خطوط ''بنام علیم صبانویدی'' مرتب کئے۔

ڈاکٹر انور مینائی، ایم. اے.، پی. ایچ. ڈی.، بنگلور

جنہوں نے علیم صبانویدی کے ہیئتی تجربوں پر مبسوط مقالہ لکھا، جو زیر اشاعت ہے۔

ڈاکٹر راحت سلطانہ، ایم. اے.، پی. ایچ. ڈی.، حیدر آباد

جنہوں نے ڈاکٹر ناز قادری، شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی کے زیر نگرانی ''علیم صبانویدی کی نعتیہ شاعری'' پر پی. ایچ. ڈی. کے لئے مقالہ لکھا۔

توفیق خان، سرونج (بھوپال)

موصوف نے ''علیم شناسی'' نامی کتاب ترتیب دی ہے جو زیر اشاعت ہے۔

خواتینِ
ٹملناڈو
کی
دینی علمی و ادبی خدمات
علیم صبا نویدی
مرتبہ
ڈاکٹر جاویدہ حبیب
ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی (اردو) ایم اے (عربی)